الرسالہ

Al-Risala

December 1996 • No. 241 • Rs. 7

ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے سوا اس مسئلہ کے
جس کو وقار کا مسئلہ بنا لیا جائے۔

The Mosque of Al-Hakim, Cairo

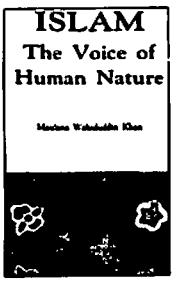

ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE
22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30

MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION
22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85

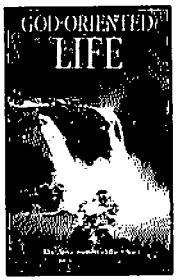

GOD-ORIENTED LIFE
22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70

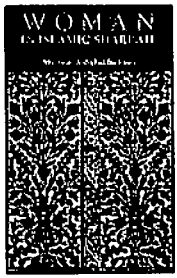

WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH
22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)

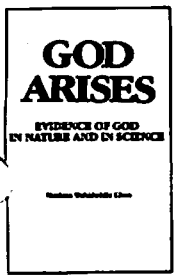

GOD ARISES
22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85

ISLAM AS IT IS
22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55

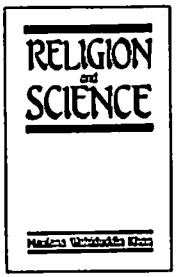

RELIGION AND SCIENCE
22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45

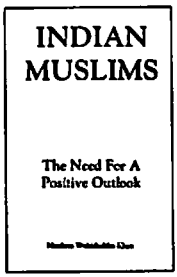

INDIAN MUSLIMS
22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۶، شمارہ ۲۴۱

فہرست

مرغوباتِ دنیا	۴	شرافت کی طاقت	۱۴
چار دور	۵	نوبرا بلم انسان	۱۵
ایک حدیث	۶	مجرم کی گرفت	۱۶
روایت کو توڑنا	۷	پاور کا جھگڑا	۱۷
جماعتِ صحابہ	۸	فرضی اندیشے	۱۸
بے ضرر ہونا	۹	صبر کی اہمیت	۱۹
یہ انسان	۱۰	تاریخی پس منظر	۲۱
خاموشی کی طاقت	۱۱	دو عظیم کردار	۲۳
قانونِ فطرت	۱۲	ایک سفر	۲۸
اخلاقی پستی	۱۳	خبرنامہ اسلامی مرکز - ۱۱۶	۴۷

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

مرغوباتِ دنیا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : لوگوں کے لیے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی، یہ سب دنیوی زندگی کے سامان ہیں، اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے (آل عمران ۱۴)

خواہشوں کی محبت (حب الشهوات) بہت عام لفظ ہے۔ اس میں دور قدیم کی مرغوب چیزوں سے لے کر موجودہ صنعتی دور کی مرغوب اشیا تک ہر چیز شامل ہے۔ ان دنیوی چیزوں کی چمک آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ آیت کے مطابق، یہ ایک پیدائشی جذبہ ہے، کوئی بھی شخص اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ایسی حالت میں ایک مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا بہترین جواب حضرت عمرؓ کی وہ دعا ہے جو صحیح البخاری میں بطور تعلیق روایت کی گئی ہے۔ اس کے مطابق، حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے قرآن کی مذکورہ آیت پڑھی گئی تو انھوں نے کہا : اللّٰهُمّ انا لا نستطيعُ الّا ان نفرحَ بما زيّنتهُ لنا۔ اللّٰهُمّ انّي اسئلك ان انفقهُ في حقه (فتح الباری ۱۱/۲۶۳) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں : لا نستطيعُ الا ان نحب ما زُيّنت لنا، فقني شرّه وارزقني ان انفقه في حقك (صفحہ ۲۶۴) ۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ، یہ ہمارے بس میں نہیں کہ ہم ان چیزوں پر خوش نہ ہوں جن کو تو نے ہمارے لیے مزین کر دیا ہے۔ اے اللہ، میں تجھ سے یہ توفیق مانگتا ہوں کہ ان چیزوں کو میں ان کے حق میں صرف کروں۔

اللہ تعالے کو یہ مطلوب نہیں ہے کہ مرغوبات دنیا کو دیکھ کر آدمی متاثر نہ ہو۔ اگر وہ متاثر نہ ہو تو پھر اس کا امتحان کس چیز میں ہوگا۔ آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر متاثر ہو مگر وہ اس میں لت پت نہ ہو جائے۔ وہ اپنے قلبی تاثر کو عملی روش بننے سے بچائے۔ وہ ظاہری مرغوبیت سے گزر کر اس کے اندرونی غیر مرغوب پہلو کو دیکھ لے۔ دنیا اسے اپنی طرف کھینچے، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کھینچ کر خدا کی طرف لے جائے۔

چار دور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دور رسالت ۲۳ سال ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو مکی دور اور مدنی دور میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم صرف مکانی پہلو کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ مرحلۂ نبوت کے اعتبار سے آپ کی ۲۳ سالہ مدت مزید کئی دوروں میں تقسیم ہوتی ہے۔ وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے اس کو چار دور کہا جاسکتا ہے۔ دو دور مکہ میں، اور دو دور مدینہ میں۔

مکی زندگی کا پہلا دور (نصف اول) وہ ہے جب کہ آپ خفیہ انداز میں دعوت دیتے تھے۔ نماز بھی چھپ کر پڑھی جاتی تھی۔ قرآن کے نازل شدہ حصوں کی تلاوت بھی چھپ کر کی جاتی تھی۔ اس کو دور اسرار کہا جاسکتا ہے۔

مکی زندگی کا دوسرا دور (نصف ثانی) وہ ہے جب کہ آپ نے اعلان کے ساتھ توحید کی دعوت دینا شروع کیا۔ نماز اور تلاوت بھی کسی حد تک کھل کر کی جانے لگی۔ اس دوسرے دور کو سمجھنے کے لیے ہم اس کو دور اعلان کہہ سکتے ہیں۔

مدنی زندگی کا پہلا نصف دور (یا نبوت کا تیسرا دور) وہ ہے جب آپ نے "صحیفۂ مدینہ" کے ذریعہ مومنین اور مشرکین اور یہود کے درمیان حلیفانہ تعلق قائم کیا۔ اس میں ہر فریق کو اپنے مذہب اور اپنی روایات پر قائم رہنے کی ضمانت تھی۔ اس تیسرے دور کو دور مصالحت کہا جاسکتا ہے۔

مدنی دور کا دوسرا نصف حصہ وہ ہے جو فتح مکہ کے بعد شروع ہوا۔ اس دور میں پورے علاقہ میں اسلام کا غیر مشترک غلبہ قائم ہوگیا۔ یہ نبوت کا چوتھا اور آخری دور تھا۔ اس کو عمومی تفہیم کے لیے دور اقتدار کہا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام کو جو قرآن دیا گیا اس کا کچھ حصہ پہلے دور میں اترا، کچھ دوسرے دور میں، کچھ تیسرے دور میں اور کچھ چوتھے دور میں۔ ہر دور میں آپ پر جو احکام اترے اس وقت آپ انھیں احکام کے مکلف تھے نہ کہ بعد کو اترنے والے احکام کے۔ ان چار دوروں میں جو باہمی نسبت ہے وہ آغاز اور تکمیل کی نہیں ہے۔ یہ دراصل چار مختلف نوعیت کے حالات کی مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو ان میں سے کسی دور میں پائیں تو وہاں وہ کس طرح رہیں۔

ایک حدیث

ابن ماجہ اور الترمذی (کتاب الزھد) میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے (ازھد فی الدنیا یحبك اللہ و ازھد فیما عند الناس یحبك الناس)

دنیا سے بے رغبتی آدمی کو ذہنی یکسوئی عطا کرتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حقائق مادی سے اوپر اٹھ کر حقائق معنوی کو اپنی ساری توجہات کا مرکز بنا سکے۔ یکسوئی کا یہ عمل اس کی زندگی میں جاری رہتا ہے۔ وہ مسلسل مادیت سے روحانیت کی طرف سفر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شخصیت مکمل طور پر ایک روحانی شخصیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دنیا سے بے رغبتی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایک ارتقاء یافتہ شخصیت بن سکے۔ یہی ارتقاء یافتہ شخصیت وہ چیز ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کر دیتی ہے۔ آدمی عبد رہتے ہوئے اپنے مزاج اور اپنے شاکلہ کے اعتبار سے خدا کے ہم سطح ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو خدا کی قربت میں جگہ ملے، وہ خدا کا پسندیدہ بندہ بن جائے۔

جب آدمی کے دل میں خدا کی محبت بیٹھتی ہے تو فطری طور پر وہ غیر متعلق چیزوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام زھد ہے۔ یہ زھد ہی خدا سے قریب ہونے کی قیمت ہے۔ زھد نہیں تو خدا کی قربت بھی نہیں۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہونا کیوں آدمی کو لوگوں کے لیے قابل قدر اور قابل محبت بنا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا آدمی لوگوں کی نظر میں ایک بلند انسان بن جاتا ہے۔ لوگوں کی چیزوں میں رغبت رکھنے والا آدمی لوگوں کو اپنے برابر کا انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اس کے حق میں لوگوں کے اندر قدر دانی کا اعلیٰ جذبہ نہیں جاگتا۔ اس کے برعکس جو آدمی لوگوں کو بے نیاز دکھائی دے اس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھیں گے ——— خدا کا محبوب بننے کا راز خدا کا طالب بننا ہے، اور لوگوں کا محبوب بننے کا راز لوگوں سے بے نیاز ہو جانا۔

روایت کو توڑنا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد امت کو سب سے زیادہ جس فتنہ سے ڈرایا تھا وہ باہمی لڑائی کا فتنہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کسی بھی عذر کو لے کر باہمی لڑائی نہ کرنا۔ کیوں کہ میری امت میں اگر ایک بار تلوار اٹھ گئی تو قیامت تک وہ دوبارہ میان میں نہیں جائے گی (اِذا وُضع فی امتی السیف لم یرفع عنھم الی یوم القیامۃ) مسند احمد

ایک عرب عالم اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگوں نے جب خلیفہ عثمانؓ کو قتل کیا تو انھوں نے اسلام کے لباس میں ایک بڑا سوراخ کر دیا اور جب انھوں نے امام حسینؓ کو قتل کیا تو انھوں نے اسلام کے لباس کو پھاڑ کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا (حین قتلوا عثمان احدثوا خرقا واسعا فی ثوب الاسلام وحین قتلوا الحسین مزّقوا الثوب تمزیقاً)

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی سماج ہمیشہ روایات کے اوپر چلتا ہے۔ کوئی صحت مند روایت کسی سماج میں نہایت مشکل سے قائم ہوتی ہے۔ اور جب کسی سماجی روایت کو کھلم کھلا توڑ دیا جائے تو دوبارہ اس کو قائم کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سماجی روایت کو توڑنا سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں انسانی احترام کی روایت قائم کی تھی۔ جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے مقدس شہر میں خلیفۂ راشد کو بے دریغ قتل کیا۔ اور جب دوبارہ ایک مسلم گروہ نے نواسۂ رسولؐ کو کھلے عام قتل کر دیا تو انھوں نے انسانی جان کے احترام کی روایت کو آخری حد تک توڑ ڈالا۔ اس کے بعد کسی کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس روایت کو دوبارہ قائم کرے۔ چنانچہ رسولؐ کی پیشین گوئی کے مطابق، وہ پوری مسلم تاریخ میں جاری و ساری ہو گئی۔

کوئی شخص اگر کسی ظلم کو مٹانا چاہتا ہے تو بطور خود وہ خواہ کتنا ہی مخلص ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ روایات کو توڑے بغیر اپنا کام کرے۔ ورنہ ظلم کے خلاف اٹھنے والا خود سب سے بڑا ظالم قرار پائے گا۔

جماعت صحابہ

صحیح مسلم (کتاب الجہاد والسیر) میں یہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بیان کیا کہ جب بدر کا دن تھا۔ اور دونوں گروہ ایک میدان میں آمنے سامنے جمع تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار مسلح افراد تھے۔ اور دوسری طرف آپ کے اصحاب صرف ۳۱۲ تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔

اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کو پکارنا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ، تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما —— اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کی اس جماعت کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی :

اللّٰھمّ إن تُھلِك ھٰذہِ العِصابۃَ مِن اھلِ الاسلام لا تُعبَد (بعدھا) فی الارض (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۲/۸۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بلا مبالغہ درست تھے۔ آپ کے یہ اصحاب جن کو حالات نے میدان بدر میں اکٹھا کیا تھا، وہ خیار انسانیت تھے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام (تمہارے جو افراد جاہلیت میں بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہوں گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرب میں جو لوگ اکٹھا ہوئے تھے، وہ پوری بشری تاریخ کے بہترین لوگ تھے، وہ لمبے تاریخی عمل کے دوران بن کر تیار ہوئے اور پھر انھیں یہ موقع ملا کہ وہ خاتم الرسل کا ساتھ دے کر وہ انقلاب برپا کریں جو ہزاروں سال سے اللہ تعالٰے کو مطلوب تھا۔ مگر اب تک وہ وقوع میں نہیں آیا تھا۔

یہ وہ قیمتی گروہ تھا جو تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کا کامل نمونہ تھا۔ وہ ایک طرف خیار انسانیت تھا اور دوسری طرف خیار اسلام۔

بے ضرر ہونا

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (البخاری) یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہی بات دوسری روایت میں اس طرح آئی ہے کہ: المسلم من سلم الناس من لسانہ (احمد) یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان (اور جس کے ہاتھ) سے لوگ محفوظ رہیں۔

ان دونوں روایتوں میں سے ایک میں "مسلم" کا لفظ ہے اور دوسری میں "لوگ" کا۔ مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ایک عام ادبی اسلوب ہے کہ کبھی کلام میں لفظی اعتبار سے بظاہر خصوص ہوتا ہے مگر اس سے عموم مراد ہوتا ہے، اور کبھی باعتبار الفاظ عموم ہوتا ہے اور اس سے خصوص مراد ہوتا ہے۔ یہ اسلوب بہت سی حدیثوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک روایت ہے کہ المسلم اخو المسلم (البخاری) یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ یہی بات دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے ان العباد کلھم اخوۃ (ابوداؤد) یعنی تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

مسلم وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے۔ جو خدا کی عظمتوں کا اس طرح ادراک کرے کہ اپنا وجود اس کو ہر اعتبار سے غیر عظیم دکھائی دینے لگے۔ ایسے انسان کے اندر جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں اسی کا ایک پہلو وہ ہے جو مذکورہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

ایسا انسان ہر لمحہ اپنے آپ کو خدا کی نگرانی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر ایسی شخصیت کی تخلیق کرتا ہے جو دوسروں کے لیے کامل طور پر بے ضرر ہو۔ اس کی زبان کسی کے خلاف نہیں کھلتی۔ اس کے ہاتھ سے کسی کو دکھ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ گویا اس کے لیے نااہل ہو جاتا ہے کہ اس کی طاقت اور صلاحیت کبھی بھی اور کسی حال میں بھی کسی کے خلاف استعمال ہو۔

مومن و مسلم انسان کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنتا اور نہ کسی کو تکلیف پہنچاتا۔ خدا کی عظمت و جلال کا احساس اس کو ایک ایسے درخت کی مانند بنا دیتا ہے جس کا کانٹا توڑ دیا گیا ہو اور اب اس میں صرف پھول ہی پھول باقی رہ جائیں۔

مومن وہ ہے جو لوگوں کے درمیان نو پرابلم انسان بن کر رہے۔

یہ انسان

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ کوئی شخص سیادت نہیں کرسکتا جب تک ایسا نہ ہو کہ اس کے کچھ محبین ہوں جو اس کی مدح کریں اور کچھ حاسدین ہوں جو اس کی مذمت کریں (لَا یَسُوْدُ سَیِّدٌ بِدُوْنِ وُدٍّ یَمْدَحُ وحسودٍ یَقْدَحُ)

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس دنیا میں جو واقعہ ہوتا ہے اس میں امتحان مصلحت لازمی طور پر شامل رہتی ہے۔ یہی معاملہ کسی صاحبِ سیادت شخص کا ابھرنا ہے۔ ایک انسان جب اللہ کی توفیق سے سیادت و قیادت کے میدان میں ابھرتا ہے تو وہ پورے معاشرہ کے لیے امتحان کا ایک پرچہ بن جاتا ہے۔

اب جو لوگ طالبِ حق ہیں، جن کے اندر سچائی کو پانے کی خواہش موجود ہے۔ جو حق کو سب سے بڑا درجہ دیے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ۔ وہ پیشگی طور پر نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ ابھرنے والے قائد کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے درمیان وہ محبوب کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ وہ دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ وہ اپنے بہترین الفاظ اور بہترین جذبات اس کے لیے وقف کردیتے ہیں۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنی ذاتی بڑائی میں جی رہے ہوں۔ جو حق کے طالب نہ ہوں بلکہ اپنی خواہش نفس کے طالب ہوں۔ ایسے لوگ جب کسی کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ فوراً حسد میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس شخص کے قد کا بڑھنا گویا میرے قد کا چھوٹا ہونا ہے۔ یہ لوگ حسد کی آگ میں بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے دائرہ سے باہر ابھرنے والے شخص کی مذمت پر کمربستہ ہوجاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ وہ اس کو نیچا دکھانے کے لیے ہر وہ پست حرکت کرنے پر تُل جاتے ہیں جو ان کے بس میں ہو ——— ہر صاحب سیادت آدمی ایک امتحان ہے۔ اس امتحان میں ایک قسم کے لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ ناکام۔

خاموشی کی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ آپ دیر دیر تک خاموش رہتے تھے : فکان طویل الصمت (مسند احمد) آپ نے فرمایا کہ تم لوگ خاموشی کا طریقہ اختیار کرو : فعلیکم بالصمت (الدارمی) الترمذی، الدارمی، مسند احمد میں ہے آپ نے فرمایا کہ جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی (من صمت نجا)

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک اہم پہلو وہ ہے جو طریق کار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شور وغل کا طریقہ اختیار کرنے والا اس دنیا میں ناکام ونامراد رہتا ہے۔ اور جو آدمی خاموش تدبیر کا طریقہ اختیار کرے، اس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوگی کہ قوانین فطرت اس کا ساتھ دیں گے اور وہ کامیابی کی مطلوب منزل تک پہنچ کر رہے گا۔

لاویٹر (Johann Kaspar Lavater) ۱۷۴۱ میں زیورک میں پیدا ہوا، ۱۸۰۱ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ فطرت کے اسی قانون کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ وہ شخص بولنا نہیں جانتا جو چپ نہیں رہ سکتا۔ وہ اس سے اور بھی کم واقف ہے کہ زیادہ موثر طور پر کوئی کام کس طرح کیا جائے :

He knows not how to speak who cannot be silent;
still less how to act with vigor and decision.

چپ رہنے والا سوچتا ہے، اور جو آدمی سوچے وہی اس لائق ہوتا ہے کہ بہتر اور موثر انداز میں کام کرسکے۔ اسی طرح جو آدمی چپ رہتا ہے وہ اپنے ذہن میں اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ وہ منصوبہ بند انداز میں اپنے عمل کا خاکہ تیار کرتا ہے، اور جو آدمی منصوبہ بند صورت میں اپنا عملی اقدام کرے، اس کا یہ فطری حق ہے کہ خدا کی اس دنیا میں وہ لازماً کامیاب ہو۔

خاموشی زیادہ بہتر کلام ہے۔ خاموشی زیادہ گہرے انداز میں عمل کرنا ہے۔ خاموش رہنے والا اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ نتیجہ خیز طور پر استعمال کرسکے۔

قانون فطرت

ولیم پن (William Penn) ۱۶۴۴ میں لندن میں پیدا ہوا، ۱۷۱۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک ایسا لیڈر تھا جس نے مذہب اور سیاست دونوں میں حصہ لیا۔ وہ مذہبی رواداری کا زبردست حامی تھا۔ اس کا ایک قول یہ ہے کہ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ کبھی وہ خود حکومت کریں گے اور کبھی ان کے اوپر حکومت کی جائے گی :

Let the people think they govern and they will be governed.

ولیم پن نے یہ بات تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پر کہی۔ مگر یہ سادہ طور پر محض تاریخ کی بات نہیں، وہ فطرت کا ایک عالم گیر قانون ہے جس کو خود خدا نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق اس دنیا میں قائم کیا ہے۔ خداوند عالم کا مقرر کیا ہوا یہ فطری قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے :

وتلك الايام نداولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰) یعنی ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔

یہاں ایام یا دن سے مراد فتح و شکست اور غلبہ اور مغلوبیت کے دن ہیں۔ اس دنیا میں جس طرح دوسری تمام چیزیں امتحان اور آزمائش کے لیے ہیں، اسی طرح سیاسی اقتدار بھی آزمائش اور امتحان کے لیے ہے۔ چنانچہ وہ باری باری ہر گروہ کو دیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کی جانچ ہو سکے۔ اس دنیا میں حاکمیت کی حالت بھی برائے امتحان ہے اور محکومیت کی حالت بھی برائے امتحان۔

آدمی کو چاہیے کہ جب اس کو حاکم بنایا جائے تو وہ فخر و ناز کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو۔ اور جب وہ اپنے آپ کو محکومیت کی حالت میں پائے تو وہ منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔ دونوں حالتوں کو وہ خدائی فیصلہ کے طور پر لے۔ دونوں حالتوں میں اس کی نگاہ خود اپنی ذمہ داری کی ادائگی پر ہو نہ کہ دوسروں کے صحیح یا غلط رویہ پر۔

یہ ایک عظیم اصلاحی عقیدہ ہے جو لوگوں کو منفی نوعیت کی سیاسی سرگرمیوں سے بچاتا ہے، وہ لوگوں کو اس قابل بناتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو ضیاع سے بچائیں۔ اور ہمیشہ مفید اور نتیجہ خیز عمل میں مصروف رہیں۔ حکومت کا چھننا خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرنا خدا کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔ اور کون ہے جو خدا کے خلاف احتجاج میں کامیاب ہو۔

اخلاقی پستی

سرسید احمد خاں کو ان کے مخالفین نے انگریز کا پٹھو کہا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے مخالفین نے ہندوؤں کا ایجنٹ بتایا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مخالفین نے دیکھا کہ انگریز سرسید احمد خاں کا احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دیکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ہندوؤں کے درمیان ایک قابل احترام حیثیت حاصل ہے۔ یہ مخالفین اپنے عناد کی وجہ سے یہ اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے کہ غیر مسلموں کے درمیان انھیں جو احترام ملا ہے، وہ ان کی کسی ذاتی خوبی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انھوں نے ان شخصیتوں کو مذکورہ قسم کے القاب دے دیے تاکہ یہ ظاہر کر سکیں کہ انھوں نے یہ درجہ محض اپنی ابن الوقتی کے ذریعہ حاصل کیا ہے نہ کہ اپنی کسی واقعی لیاقت کے ذریعہ۔

اس قسم کا قول بظاہر ایک تنقید ہے، مگر حقیقۃً وہ کمینگی ہے، اور کمینگی بلاشبہ تمام غیر اخلاقی حرکتوں میں سب سے زیادہ بری اور ذلیل حرکت ہے۔

تنقید ہر آدمی کا فطری حق ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ دوسرے آدمی میں کوئی غلط بات دیکھے تو برملا اس کا اظہار کرے۔ مگر یہ حق مدلل اختلاف رائے کے لیے ہے نہ کہ عیب جوئی اور الزام تراشی کے لیے۔ جو لوگ اختلاف کے وقت کمینگی کی سطح پر اتر آئیں وہ خود اپنے بارہ میں زیادہ شدت کے ساتھ وہی الزام ثابت کر رہے ہیں جس کو وہ دوسرے کے اوپر چسپاں کرنا چاہتے تھے۔

کردار کی یہ قسم ہر دور میں پائی گئی ہے۔ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں بھی ایسے پست افراد موجود تھے، آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں، اور وہ بدستور اسی طرح باقی رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے جب کہ لوگوں سے یہ موقع ہی چھن جائے گا کہ وہ کسی کے اوپر جھوٹا الزام لگائیں یا کسی کی کردار کشی کریں۔

صحت مند اختلاف سراپا خیر ہے مگر الزام تراشی سراپا شر ہے۔ جس سماج میں الزام تراشی کا رواج ہو۔ لوگ ایک دوسرے کو برا القاب دینے لگیں، وہ سماج کمینہ اخلاقیات کی تربیت گاہ بن جاتا ہے۔ اور کسی سماج کے لیے اس سے زیادہ بری حالت اور کوئی نہیں۔

شرافت کی طاقت

سابق وائس پریسیڈنٹ آف انڈیا محمد ہدایت اللہ صاحب (۱۹۹۲-۱۹۰۵) کا ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ان کے پی اے مسٹر اظہر صدیقی ایم اے نے مجھے بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار پنجاب کے سکھ پیشواؤں کا ایک وفد ہدایت اللہ صاحب سے ملنے کے لیے نئی دہلی آیا۔ وہ لوگ اپنی روایات کے مطابق، کرپان لگائے ہوئے تھے۔ وائس پریسیڈنٹ کی سرکاری رہائش گاہ پر سیکوریٹی کے جو لوگ تھے، انھوں نے سکھوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنی یہ کرپانیں باہر ہمارے پاس رکھ دیں۔ اس کے بعد وائس پریسیڈنٹ سے ملنے کے لیے اندر جائیں۔ وہ لوگ اپنی کرپانیں باہر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اب بات بڑھی۔ سیکوریٹی افسر نے ٹیلی فون کے ذریعہ وائس پریسیڈنٹ کے سکریٹری سے رابطہ قائم کیا اور صورت حال بتائی۔ سکریٹری نے آرڈر دے دیا کہ انھیں کرپانوں کے ساتھ اندر مت جانے دو، اور اگر وہ اس طرح اندر جانے پر اصرار کریں تو ان کو گرفتار کر لو۔

اظہر صدیقی صاحب نے بتایا کہ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ چنانچہ میں فوراً اندر گیا اور ہدایت اللہ صاحب سے مل کر انھیں بتایا کہ یہاں اس قسم کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ اور سیکوریٹی افسر اور سکریٹری کا رویہ سراسر حکمت کے خلاف ہے۔ آپ ملٹری افسر سے براہِ راست کہہ دیں کہ وہ ان لوگوں کو نہ روکیں اور انھیں کرپانوں کے ساتھ اندر آنے دیں۔ ہدایت اللہ صاحب معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اور اس کے مطابق ٹیلی فون پر سیکوریٹی افسر کو ہدایت دے دی۔

اس کے بعد سکھ وفد اپنی کرپانوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ہدایت اللہ صاحب کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے اپنی کرپانوں کو اتار کر ہدایت اللہ صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم کمینہ پن کریں گے کہ یہاں آکر آپ کے اوپر ان کرپانوں سے حملہ کر دیں۔ آپ ہمارے لیے باپ کے برابر ہیں۔ ہم تو ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔

حکمت سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر آپ حکمت کا طریقہ اختیار کریں تو مسلح دشمن بھی اپنے ہتھیاروں کو پھینک دے گا اور آپ کی انسانیت کے اعتراف میں آپ کے قدموں پر گر جائے گا۔

نوپرابلم انسان

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : واللہ لایؤمن واللہ لایؤمن واللہ لایؤمن الذی لایأمن جارہ بوائقہ (البخاری، کتاب الادب) خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور پڑوسی کو ستانا دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان ہوگا تو پڑوسی کو ستانا نہیں ہوگا، اور جہاں پڑوسی کو ستایا جارہا ہو وہاں ایمان موجود نہ ہوگا۔

اگر کسی مقام پر پھول ہو تو آس پاس کے لوگوں کو خوشبو مل رہی ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول تو موجود ہو مگر ماحول کو اس سے بدبو کا تحفہ ملے، اسی طرح مومن خدا کا زندہ پھول ہے۔ وہ جہاں بھی ہو وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو خوشبو دار سلوک کی نعمت دے رہا ہوگا۔ اور اگر کسی ماحول میں لوگوں کو بدبو دار سلوک کا تجربہ ہو رہا ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ وہاں نہ ایمان ہے اور نہ وہاں مومن کا کوئی وجود ہے۔

ایمان کیا ہے، ایمان شخصیت کی تعمیر ہے۔ ایمان ایک انسان کو عام انسان کے درجہ سے اٹھا کر خاص انسان بنا دیتا ہے۔ اب وہ ایک محتاط انسان بن جاتا ہے۔ اب وہ صرف اپنے آپ میں نہیں جیتا بلکہ دوسروں کی رعایت کو بھی وہ اپنے لیے لازم قرار دے لیتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کی سرگرمیاں دوسرے کے لیے تکلیف کا سبب تو نہیں بنیں گی۔ اس کی اس محتاط روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے پڑوسیوں کو اس کی طرف سے کسی برے تجربہ کا سابقہ پیش نہیں آتا۔

حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، اس کو لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ مومن ایک نوپرابلم انسان ہوتا ہے۔ وہ خواہ جہاں بھی ہو، ہر جگہ اس کے پاس کے لوگوں اور اس سے تعلق رکھنے والوں کو اس سے راحت ملتی ہے، کسی کے لیے بھی وہ مسئلہ پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

ایمان کا اول درجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے لیے نفع بخش بنیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ لوگوں کو آپ اپنے ضرر سے بچائیں۔ اس کے بعد ایمان کا کوئی تیسرا درجہ نہیں۔

مجرم کی گرفت

۱۷ جون ۱۹۹۶ کے اخباروں میں برطانیہ کی ایک خبر اس عنوان کے ساتھ چھپی ——— کیمرہ نے بم سے بھری ہوئی گاڑی کا فوٹو لے لیا :

Cameras captured bomb-laden van

قصہ یہ تھا کہ ۱۶ جون ۱۹۹۶ کو مانچسٹر کے ایک شاپنگ سنٹر میں ایک وین (گاڑی) آکر کھڑی ہوئی۔ وہ طاقت ور بموں سے بھری ہوئی تھی، دو آدمی اس کو لے کر آئے۔ انھوں نے گاڑی وہاں کھڑی کی اور پھر اتر کر بھاگ گئے۔

کچھ دیر کے بعد اس کے بم زور دار دھماکہ کے ساتھ پھٹ گئے۔ عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ دو سو سے زیادہ آدمی زخمی ہوگئے۔ کئی آدمی مر گئے۔ ایک میل کے دائرہ میں افراتفری پھیل گئی۔ لوگ چاروں طرف بدحواسی کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ اس حادثہ میں بم والی گاڑی مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ بظاہر اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

مگر اس شاپنگ سنٹر میں ویڈیو کیمرے (security video cameras) لگے ہوئے تھے۔ مذکورہ گاڑی جب اس مقام پر داخل ہوئی تو فوراً ہی ان کیمروں نے اس کے فوٹو لینا شروع کر دیے۔ حتی کہ اس کو لانے والے جب گاڑی سے اتر کر بھاگے تو ان کے فوٹو بھی اس نظام نے کھینچ لیے۔ اس کے نتیجے میں پولیس کو گاڑی کی قسم، اس کا نمبر، اس کا رنگ اور اس کے ڈرائیور، سب کی بابت معلومات ہوگئیں۔ اس کے ذریعہ معلوم ہوگیا کہ آئرش ری پبلکن پارٹی (IRA) کے لوگوں نے یہ کارروائی کی ہے۔ چنانچہ جلد ہی وہ لوگ پکڑ لیے گئے۔

یہ واقعہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح اس دنیا میں خدا نے نگرانی کا نظام قائم کر رکھا ہے جو ہر آن اور ہر لمحہ انسان کے اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہا ہے۔ حتی کہ جرم کے آثار مٹنے سے پہلے وہ جرم کا ریکارڈ محفوظ کر لیتا ہے۔ کسی بھی حال میں کسی انسان کے لیے اپنے آپ کو خدا کی نظر سے چھپانا ممکن نہیں۔ لوگ اس نظام کو نہیں دیکھتے۔ مگر یہ نظام ہر آن لوگوں کو دیکھ رہا ہے اور ہر لمحہ ان کا ریکارڈ تیار کر رہا ہے۔

پاور کا جھگڑا

کسی گھر میں ساس اور بہو کا جھگڑا کیوں ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو کھانا کپڑا اور ضروریات زندگی دونوں میں سے ہر ایک کو پوری طرح ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ پھر جھگڑا کس بات کا۔ یہ جھگڑا صرف پاور کا ہوتا ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر کا سارا اختیار میرے پاس رہے۔ اختیار یا پاور چوں کہ غیر مشترک چیز ہے، وہ کسی ایک ہی کے پاس رہ سکتا ہے۔ اس لیے دونوں میں مستقل جھگڑا قائم ہو جاتا ہے۔

مسجد اور مدرسہ میں جھگڑا کیوں ہوتا ہے۔ وہاں بھی ہر ایک کو عبادت اور تعلیم یا ادارہ کی خدمت کے یکساں مواقع ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر جھگڑا کیوں۔ یہ جھگڑا بھی صرف پاور کا ہے۔ کچھ افراد چاہتے ہیں کہ سارا اختیار میرے ہاتھ میں رہے، اس پر ان لوگوں سے ان کا جھگڑا ہو جاتا ہے جو انھیں کی طرح خود بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہ تنہا سارے اختیارات کے مالک ہوں۔

اسی طرح کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، برما، فلپائن، فلسطین اور دوسرے مقامات کا جھگڑا کیوں ہے۔ یہ تمام جھگڑا بھی پاور کا جھگڑا ہے۔ جھگڑا برپا کرنے سے پہلے ہر جگہ کے مسلمانوں کو زندگی کی ضروریات بفراغت ملی ہوئی تھیں۔ دینی اور تعلیمی اور اقتصادی کام کے مواقع بھی انھیں پوری طرح حاصل تھے۔ اس کے باوجود ہر جگہ خونی جنگ کیوں برپا ہو گئی، صرف پاور کے لیے۔

مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ پاور کی یہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی۔ مثلاً پاکستان میں ہندو سے اور افغانستان میں کمیونسٹوں سے پاور کی جنگ ختم ہوئی تو دوبارہ وہی جنگ مزید اضافہ کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ کیوں کہ پاور اشتراک کو قبول نہیں کرتا۔ جب کہ اس کے خواہش مند کئی ہوتے ہیں، اس لیے پاور ہنگری سماج میں پاور کی جنگ ابدی طور پر جاری رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاور ایک دردِ سر ہے۔ دردِ سر کو دوسروں کے حوالے کر کے ضروریاتِ زندگی اور مواقع حیات پر قانع بن جائیے، اور پھر سماج میں جنگ اور ٹکراؤ کی حالت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ پاور کے لیے وہ لوگ لڑتے ہیں جن کو کوئی کام کرنا نہ ہو۔ کیوں کہ کام کرنے کا موقع تو ہر حال میں ہر انسان کے لیے موجود رہتا ہے۔

فرضی اندیشے

۲۱ جولائی ۱۹۹۶ کو بنگلور (سبرامنیم پورہ) میں ایک عبرت انگیز واقعہ ہوا۔ ایک لڑکا جی ہریش بابو دیویکانند ہائر پرائمری اسکول میں فورتھ اسٹینڈرڈ (چوتھے درجہ) کا طالب علم تھا۔ اس نے اپنے گھر کے ایک کمرہ میں اپنے کو بند کرکے اپنے اوپر مٹی کا تیل (کروسین) انڈیل لیا اور اپنے کپڑوں کو آگ لگالی۔ اس طرح وہ جل کر مرگیا۔ اخباری رپورٹ کے الفاظ میں، اس کا سبب، امتحان میں ناکام ہوجانے کا اندیشہ تھا :

Fear of failure in examinations.

لڑکے کے باپ جی گوپی ناتھ نے بتایا کہ ہریش حسب معمول اپنے اسکول سے واپس آیا۔ اس نے اپنی ماں لیلا سے کہا کہ اس کی ٹیچر اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے مطابق لیلا اسکول چلی گئی۔ اس کے بعد ہریش نے کچن میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا اور اپنے آپ کو آگ لگالی۔ آواز سن کر پڑوسی دوڑ پڑے۔ مگر جب کچن کا دروازہ توڑ کر لڑکے کو نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جل کر مر چکا ہے۔

لڑکے کی ماں لیلا جب اسکول پہنچی تو وہاں اس کو نتیجہ کا پرچہ (marks card) دیا گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کیوں کہ اس کے لڑکے نے ۶۰۰ میں ۳۷۹ نمبر حاصل کیے تھے مگر جب وہ گھر پہنچی تو اس کی خوشیاں غم میں تبدیل ہوگئیں۔ کیوں کہ اس نے دیکھا کہ اس کا لڑکا خودکشی کرکے اپنی جان دے چکا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ جولائی ۱۹۹۶)

ہریش بابو اگر چند گھنٹے اور انتظار کرلیتا تو اس کو معلوم ہوجاتا کہ اس کا اندیشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ امتحان میں وہ اچھے نمبر لاکر پاس ہوچکا تھا، مگر وہ فرضی اندیشے میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خوف کے تحت اپنی جان دے دی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حالات کا غلط اندازہ کرکے آدمی اندیشوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل بتاتا ہے کہ وہ اندیشے سرے سے پیش آنے والے ہی نہ تھے۔

جو چیز آج نہ مل رہی ہو اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔ بجائے اس کے کہ اس کو نہ ملنے والی چیز سمجھ کر آپ مایوسی اور بے ہمتی کا شکار ہوجائیں

صبر کی اہمیت

صبر دین کا خلاصہ ہے۔ صبر ہر قسم کی نیکیوں کی بنیاد ہے۔ صبر دنیا میں کامیابی کا زینہ ہے اور آخرت میں وہ جنت کی کنجی ہے۔ قرآن میں صبر کے بارہ میں ایک ایسی آیت ہے جو کسی بھی دوسرے عمل کے بارہ میں نہیں۔ فرمایا کہ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما اُعطی احد عطاء خیراً و اوسع من الصبر۔ یعنی صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا کوئی عطیہ انسان کو نہیں دیا گیا۔ ابن حجر العسقلانی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صبر تمام اعلیٰ اخلاقیات کا جامع ہے (الصبر جامع لمکارم الاخلاق)

احادیث و آثار میں کثرت سے صبر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے اپنی زندگی کا خیر صبر ہی کے ذریعہ حاصل کیا ہے: وجدنا خیر عیشنا بالصبر (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۱/۳۰۹ - ۳۱۰) ابن جوزی نے لکھا ہے کہ عاقبۃ الصبر الجمیل جمیلۃ (صید الخاطر ۳۹۹) یعنی صبر جمیل کا انجام بھی جمیل ہے۔

ابن منظور نے لکھا ہے کہ (اصل الصبر الحبس، والصبر نقیض الجزع۔ یعنی صبر کی اصل حبس ہے، صبر جزع کا الٹا ہے (لسان العرب ۴/۴۳۸) راغب الاصفہانی نے لکھا ہے کہ الصبر الامساك، والصبر حبس النفس علی ما یقتضیہ العقل والشرع۔ یعنی صبر کی حقیقت امساک ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی عقل اور شریعت کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو روکے (المفردات فی غریب القرآن ۲۷۳)

صبر کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ موجودہ دنیا کی صورت حال ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اسی امتحان یا آزمائش کی مصلحت کی بنا پر یہاں ہر شخص کو پوری آزادی دی گئی ہے۔ یہ انسانی آزادی خود خدا کے منصوبہ کے تحت ہے، اس لیے کوئی بھی اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔

اس دنیا میں انسان آزاد ہے کہ وہ خدا کو مانے یا اس کا انکار کر دے۔ وہ خدا کے پیغمبر کا اعتراف کرے یا اس کو گالی دے اور اسے پتھر مارے۔ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں نیکی کا طریقہ اختیار کرے یا ظالم اور ناانصاف اور غلط کار بن جائے۔

اسی آزمائشی آزادی نے موجودہ دنیا میں صبر کو اتنا زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی اوصاف کے ساتھ زندگی گزارے جس کو ربانی زندگی کہا گیا ہے۔ مگر اس ربانی زندگی کو اختیار کرنے میں بار بار رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اس معیار انسانیت پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے کہ جو مخالفانہ ماحول کے باوجود اس پر قائم رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

صبر آدمی کے اندر یہی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ آدمی کے اوپر خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے، اس وقت وہ صبر کر کے اپنے آپ کو خواہشات کا شکار ہونے سے بچاتا ہے۔ لوگ اس کو ستاتے ہیں اور اس کے خلاف اشتعال انگیزی کرتے ہیں۔ اس وقت وہ صبر کرتا ہے تاکہ اس کی حالتِ روحانی بھنگ نہ ہونے پائے۔ لوگ اس کے خلاف دشمنانہ کارروائی کرتے ہیں، اس وقت وہ صبر کے ذریعہ اپنے کو تھامتا ہے تاکہ وہ ان کے مقابلہ میں جلد بازی کا کوئی اقدام نہ کرے بلکہ ٹھنڈے ذہن سے سوچ سمجھ کر منصوبہ بند انداز میں ان کا موثر جواب دے۔

صبر بظاہر کسی انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اس لیے آدمی فوراً صبر کرنے کو اپنے لیے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے صبر کیا تو یہ دوسرے شخص کے مقابلہ میں ہار ماننا یا اپنے آپ کو بے عزت کرنا ہوگا۔ یہی خاص نفسیات ہے جس کی بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی صبر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ صبر کا تعلق انسان سے نہیں ہے بلکہ خدا سے ہے۔ آدمی جب صبر کرتا ہے تو گویا کہ وہ کہتا ہے کہ میں خدا کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ یہ خود خدا ہے جس نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ وہاں صبر کے بغیر کوئی کام نہ ہو سکے۔ اس لیے اس دنیا میں صبر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی نظام قدرت کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ وہ قدرت کے نقشہ کو بدلے بغیر اس کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا رہا ہے۔ صبر خدا کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی محکومی کا اقرار ہے۔ صبر ایک عبادت ہے بلکہ سب سے بڑی عبادت۔

تاریخی پس منظر

انسان کو زمین پر اس لیے بسایا گیا تھا کہ وہ ایک خدا کا پرستار بنے اور اس کا شکر کرتے ہوئے یہاں زندگی گزارے۔ مگر بہت جلد ایسا ہوا کہ انسان مخلوقات کی پرستش کرنے لگا۔ وہ خالق کا شکر گزار بننے کے بجائے مخلوقات کی شکر گزاری کرنے لگا۔ روشن سورج، اونچا پہاڑ، رواں دریا اور دوسری مخلوقات کی عظمت میں وہ اتنا گم ہوا کہ اللہ کی عظمت اسے یاد نہ رہی۔

اس طرح انسان توحید کے راستہ کو چھوڑ کر شرک کے راستہ پر چل پڑا۔ پوری انسانی تہذیب شرک کے رنگ میں رنگ گئی۔ پیدائش اور موت کی رسموں سے لے کر زندگی کے اجتماعی نظام تک ہر چیز پر مشرکانہ تصور غالب آگیا۔ بادشاہ بھی بہت سے خداؤں میں سے ایک خدا بن گئے جو مقدس سیاسی حق کے تحت لوگوں پر حکومت کرنے لگے۔ اس زمانہ میں ساری دنیا میں مطلق شہنشاہیت (monarchical absolutism) کا دور دورہ ہوگیا۔ چند افراد یا چند خاندان بادشاہت کے خدائی حقوق (divine right of kings) حاصل کر کے لوگوں کے اوپر ایسے حکمراں بن گئے جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔

اس صورت حال کا نقصان صرف یہ نہیں ہوا کہ انسان وحدت حق کی نعمت سے محروم ہوگیا۔ بلکہ اس کا شدید تر نقصان یہ ہوا کہ ساری دنیا میں وہ جارحانہ برائی رائج ہوگئی جس کو مذہبی ایذا رسانی (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ چوں کہ بادشاہت کا پورا نظام شرک کے تصور پر قائم تھا، اس لیے توحید کی کوئی بات بادشاہوں کو اپنے حق حکمرانی کے خلاف براہِ راست چیلنج دکھائی دینے لگی۔ وہ ایسی دعوت کے لیے آخری حد تک بے برداشت (intolerant) ہوگئے۔ جب کہیں کوئی داعی توحید کا پیغام لے کر اٹھتا، اس کو فوراً سیاسی طاقت کے زور پر کچل دیا جاتا۔

اس صورت حال کے مسلسل جاری رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ و تہذیب میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اب جو بھی مرد یا عورت پیدا ہوتے وہ اسی مشرکانہ ماحول میں پیدا ہوتے اور ماحول اور نظام کے اثر سے وہ مکمل طور پر اسی کے رنگ میں رنگ جاتے۔ اس طرح شرک

محض ایک خارجی عقیدہ نہ رہا بلکہ وہ خود شاکلۂ انسانی کا جزء اعظم بن گیا۔ اب یہ ناممکن ہوگیا کہ قدیم شہروں اور آبادیوں میں پیدا ہونے والا آدمی شرک کے تسلط سے نکل سکے۔

پھر اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کا عقیدہ صرف انفرادی عقیدہ کے درجہ میں رہا۔ وہ عمومی انسانی انقلاب کی صورت اختیار نہ کرسکا۔ کیوں کہ عمومی انقلاب برپا کرنے کے لیے انسانوں کی ایک قابل لحاظ ٹیم درکار تھی، اور مروجہ مشرکانہ تہذیب میں اس کا امکان ہی ختم ہوگیا کہ بڑی تعداد میں لوگ توحید کو اختیار کریں اور پھر وہ ٹیم وجود میں آسکے جو جدوجہد کرکے مشرکانہ نظام کو ختم کرے اور موحدانہ انقلاب دنیا میں برپا کرے۔

تاریخ جب یہاں تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہوا کہ خصوصی تدبیر کے ذریعہ انسانوں کی ایک نئی جماعت تیار کی جائے۔ اسی منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ اپنی اولاد کو عرب کے صحرا میں لے جاکر بسادیں تاکہ وہاں کے غیر آباد علاقہ میں ایک ایسی قوم تیار ہو جو خالص فطرت کے ماحول میں پرورش پاکر نکلی ہو۔ اور اس کے لیے دین فطرت کو اختیار کرنا آسان ہوجائے۔

تمدن سے دور عرب کے صحرا میں خالص فطرت کے ماحول میں یہ قوم بنتا تیار ہوئی۔ توالد و تناسل کے فطری نظام کے تحت اس قوم (بنو اسماعیل) کو بننے میں تقریباً ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ جب یہ قوم پوری طرح تیار ہوچکی تو اس کے اندر مکہ میں نبی آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کی بعثت ہوئی۔ اس قوم کے تمام منتخب افراد آپ کے گرد اکٹھا ہوگئے۔ اور پھر آپ کی رہنمائی میں انھوں نے وہ تاریخی جدوجہد کی جس نے انسانیت کا نقشہ یکسر بدل دیا۔

یہی وہ جماعت ہے جس کو قرآن میں خیر امت کہا گیا، اور یہی وہ جماعت ہے جس کو غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العصابہ فرمایا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر تمام اعلیٰ بشری اوصاف کامل ترین صورت میں جمع ہوگئے تھے۔ وہ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ حق کو اس کی مجرد صورت میں دیکھیں اور کھلے طور پر اس کا اعتراف کریں۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور انھیں جو کرنا تھا وہی بولتے تھے۔ ان کی زندگی اصولوں کے تابع تھی نہ کہ مفادات کے تابع۔ وہ اختلاف کے باوجود متحد رہتے تھے، وہ قابل پیشین گوئی کردار کے حامل تھے۔ وہ مکمل انسان تھے اور مکمل موحد۔

دو عظیم کردار

ایک روایت کے مطابق، حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے علم حدیث محفوظ کیا تھا، پھر میں نے اس کو خوب پھیلا دیا (فبثثتہ) فتح الباری ۱/۲۶۱

یہ بث حدیث یا حدیثِ رسولؐ کو آپ کے بعد لوگوں تک پہنچانا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک عظیم منصوبۂ الٰہی تھا جس کی تکمیل خاص طور پر دورِ اول کی دو اسلامی شخصیتوں کے ذریعہ انجام پائی۔ ایک ابو ہریرہؓ (عبد الرحمٰن) بن صخر، اور دوسرے عائشہ بنت ابی بکر الصدیقؓ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک خاص زمانہ میں ہوئی۔ مگر آپؐ خاتم النبیین تھے۔ اس لیے آپ کی تعلیمات کو اگلی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کامل صورت میں محفوظ رہیں۔ تحفظ سنت کا یہ کام دورِ پریس سے پہلے کے حالات میں صرف زندہ انسان ہی انجام دے سکتے تھے۔ جو آپؐ کی ہر چیز کو براہ راست دیکھ کر اور سن کر محفوظ کر لیں۔ اور پھر لمبی مدت تک لوگوں کو اسے سناتے اور بتاتے رہیں۔ تاکہ بعد کو آنے والی نسلیں اس سے محروم نہ رہیں۔

اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو دوسری ضروری صلاحیتوں کے ساتھ کم عمر بھی ہوں۔ تاکہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد وہ لمبے عرصہ تک باقی رہیں۔ رسول اللہؐ کا ہم عمر آدمی اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا۔ کیوں کہ آپ کے ساتھ اس کی بھی وفات ہو جاتی اور پھر اچانک روایتِ حدیث کا تسلسل ختم ہو جاتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ وہ دو تاریخی شخصیتیں ہیں جن کو خدا نے خاص طور پر اس کام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ ایک کو آپ کے صحابی کی حیثیت سے اور دوسرے کو آپ کی اہلیہ کی حیثیت سے۔ یہ دونوں کم عمری میں رسول اللہؐ سے وابستہ ہو گئے۔ اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد دونوں تقریباً پچاس سال تک دنیا میں باقی رہے۔ اور آپ کے حق میں زندہ ٹیپ ریکارڈر کا کام کرتے رہے۔

رسول اللہؐ کی وفات ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ کی وفات ۵۸ھ (۶۷۸ء) میں اور حضرت ابو ہریرہ کی وفات ۵۹ھ (۶۷۹ء) میں۔ آپؐ کے بعد ان دونوں

کے ذریعہ جو احادیث امت کو ملیں ان کی تعداد حسب ذیل ہے :

روایات عائشہ ۲۲۱۰ ، روایات ابوہریرہ ۵۳۷۴

حضرت ابوہریرہؓ کا کام اصلاً احادیث رسولؐ کو یاد رکھنا اور ان کو امت تک منتقل کرنا تھا۔ اس کام کے لیے جو خاص صلاحیت درکار تھی وہ حافظہ ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ اس معاملہ میں خود شناس تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں اسلام کی تاریخ میں کیا کردار ادا کرنا ہے اور اس کے لیے ان کو کون سی صلاحیت درکار ہے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میں آپ کی باتیں سنتا ہوں مگر ان میں سے بہت سی باتیں بھول جاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس کے لیے دعا کرو۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے دعا کی اور کہا : (اللهم انی اسئالك علماً لاينسى (اے اللہ، میں تجھ سے نہ بھولنے والا علم مانگتا ہوں) حضرت ابوہریرہؓ نے جب یہ دعا کی تو رسول اللہؐ نے اس پر آمین کہی یعنی اے اللہ، تو ابوہریرہ کی اس دعا کو قبول فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کوئی سنی ہوئی بات کبھی فراموش نہیں کی (فما نسيت شيئاً بعد، فتح الباری ۱/۶۰ - ۲۵۹)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اس کے بعد میں نے آپؐ کی جو بات بھی سنی وہ مجھے پوری طرح یاد ہو گئی (فوالذی بعثه بالحق ما نسيت (بعد ذلك) شيئاً سمعته منه) صفحہ ۲۶۰

دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ کی مدد سے حضرت ابوہریرہ کو وہ چیز حاصل ہو گئی جس کو آج کل کی زبان میں تصویری حافظہ (photographic memory) کہا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے لیے ممکن ہو گیا کہ رسول اللہؐ کی ہر سنی ہوئی بات انھیں یاد رہے اور آپؐ کی وفات کے بعد وہ تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو علم نبوت پہنچاتے رہیں۔ دور پریس سے پہلے حدیث کی حفاظت اور اشاعت کی یہی واحد ممکن صورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ کو خصوصی طور پر اس مقصد کے لیے استعمال فرمایا۔

۲۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق ہجرت سے ۹ سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں۔ روایات

کے مطابق رسول اللہؐ سے ان کا نکاح ہوا تو ان کی عمر اس وقت تقریباً چھ سال تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ رسول اللہؐ کی صحبت میں رہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہؐ کی وفات ہوگئی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت عائشہ پیدائشی طور پر نہایت زیرک تھیں۔ وہ بلاشبہ ان استثنائی شخصیتوں میں سے تھیں جن کو تخلیقی ذہن (creative mind) کہا جاتا ہے۔ ان کی یہی اعلیٰ صلاحیت وہ اصل سبب تھا جس کی بنا پر وہ زوجیتِ رسولؐ کے لیے چنی گئیں۔

اس نکاح کا اصل مقصد ایک ذہین خاتون کو اس کا موقع دینا تھا کہ وہ رسولؐ کے ساتھ رہ کر علم نبوت کو بھرپور طور پر اخذ کرے اور آپ کے بعد اسے لمبے عرصہ تک لوگوں تک پہنچاتی رہے۔ اس مقصد کے اعتبار سے بلاشبہ کم عمری کا نکاح ہی کارآمد ہو سکتا تھا۔

نفسیاتی تحقیق کے مطابق ۱۰ سال تک کی عمر کا زمانہ کسی مرد یا عورت کے لیے تشکیلی زمانہ (formative period) ہوتا ہے۔ اس عمر میں آدمی جیسا بن جاتا ہے وہ ہمیشہ ہی ویسا رہتا ہے۔ چنانچہ حکمتِ ربانی سے اسی اہم مرحلۂ عمر میں حضرت عائشہ کو پیغمبر اسلام سے وابستہ کر دیا گیا۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر حضرت عائشہ کے لیے معروف معنوں میں صرف ازدواجی گھر نہ تھا بلکہ فن تعلیم کی اصطلاح میں وہ ان کے لیے ایک مدرسۂ تیاری (preparatory school) تھا۔ یہاں اٹھارہ سال کی عمر تک رہ کر وہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ تیار کی گئیں تاکہ اس کے بعد وہ کردار ادا کرنا ان کے لیے ممکن ہو جائے جو تقدیر الٰہی کے مطابق انھیں تاریخ میں ادا کرنا تھا۔

حضرت عائشہ کی لیاقت کے بارے میں لوگوں نے بہت اعلیٰ رائیں دی ہیں۔ مثلاً عطاء بن ابی رباح نے کہا: کانت عائشۃ افقہ الناس و اعلم الناس (عائشہ سب سے زیادہ فقیہہ اور سب سے بڑی عالم تھیں) حضرت موسیٰ الاشعری کہتے ہیں کہ اصحاب محمد کے سامنے جب بھی کوئی مشکل مسئلہ آتا تو وہ عائشہ سے پوچھتے اور ان کے پاس وہ اس کا علم پا لیتے (البدایہ والنہایہ ۹۲/۸)

الحافظ ابو عبد اللہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) نے لکھا ہے کہ عائشہ فقہاء صحابہ میں سب سے عظیم تھیں (کانت اکبر فقہاء الصحابۃ) تذکرۃ الحفاظ ۲۷/۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواج کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ ان سے

زیادہ ذہین اور اخاذ ہیں۔ حضرت سودہؓ نے اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا کہ انھوں نے اپنی باری حضرت عائشہ کو دے دی تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ زیادہ دیر تک رسول اللہ کی صحبت میں رہیں اور زیادہ سے زیادہ اخذ اور استفادہ کر سکیں اور پھر امت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں۔ گویا حضرت سودہؓ بالواسطہ طور پر اس تاریخی کردار میں شریک ہو گئیں جو حضرت عائشہ کو براہ راست طور پر ادا کرنا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اگرچہ کچھ استنباطات کی روایت کی گئی ہے۔ تقی الدین السبکی نے "فتاوی ابی ھریرۃ" کے نام سے ان کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ خداوندی کے اعتبار سے حضرت ابو ہریرہ کی اصل حیثیت ناقل کی ہے۔ اسی لیے ان کو غیر معمولی حافظہ دیا گیا تاکہ وہ نقل حدیث کا کام کامل انداز میں انجام دے سکیں۔

اس کے مقابلہ میں حضرت عائشہ کا رول تخلیقی یا اجتہادی تھا۔ انھیں صرف اقوال رسول کو نقل کرنا نہیں تھا بلکہ آپ کے قول کو سن کر اور آپ کے عمل کو دیکھ کر اس سے مزید مسائل کو مستنبط کرنا تھا۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ کے یہاں نقل حدیث سے زیادہ استنباط کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ کو اسلام کی تاریخ میں جو اہم کردار ادا کرنا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم عمری میں پیغمبر خدا کی رفیقۂ حیات بن جائیں۔ اس طرح ایک طرف یہ ممکن ہو گیا کہ ان کی تشکیلی عمر کا ایک اہم حصہ پیغمبر کے ساتھ گزرے۔ دوسری طرف اسی بنا پر وہ اس ضروری انتظام کا وسیلہ بن گئیں کہ پیغمبر کی وفات کے بعد ما قبل پریس دور میں بھی آپ کی تعلیمات کی اشاعت مزید آدھی صدی تک مسلسل جاری رہے تا آنکہ کتابت حدیث کا عمل شروع ہو جائے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ لمبی مدت تک بہت قریب سے پیغمبر کی زندگی اور آپ کے قول و عمل کا مشاہدہ کر سکیں۔ اور اس کی حکمتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھ کر اسے اگلی نسلوں تک پہنچائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف گھر کی زندگی میں پیغمبر کو دیکھتی اور سنتی تھیں بلکہ مسجد سے متصل رہائش کی وجہ سے اکثر آپ کی باہر کی گفتگو اور تقریر کو بھی سنتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ سفروں میں بھی وہ پیغمبر کے ساتھ رہتی تھیں جو گویا ان کے لیے توسیعی تربیت گاہ کے ہم معنی تھا۔

ایک مثال

اس معاملہ کی ایک مثال وہ روایت ہے جو صحیح البخاری (کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن) میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، ایک شخص کے سوالات کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ قرآن میں پہلے ایک عرصہ تک وہ آیتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگوں کے قلوب تیار ہو گئے تو حرام و حلال کے احکام اتارے گئے۔ اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو اور زنا نہ کرو تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم تو کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (لقالوا لا ندع الخمر ابدًا، لا ندع الزنا ابدًا) فتح الباری ۸/۶۶۵

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اس قول میں وہ حکمت بیان کی ہے جس کو تدریجی عمل (gradual process) کہا جاتا ہے۔ تدریج کے اس معاملہ کو انھوں نے کیسے جانا۔ کیونکہ قرآن میں یا حدیث میں یہ بات کہیں بھی انھیں لفظوں میں موجود نہیں ہے۔ اس کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ طویل مدت تک ان کو پیغمبر کی صحبت و رفاقت مسلسل طور پر حاصل رہی۔

دین کی اس حکمت کو جاننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ مکہ سے لے کر مدینہ تک پیغمبر کے احوال کو دیکھیں۔ وہ نزول قرآن کے مذکورہ دونوں دور کا براہ راست مشاہدہ کریں۔ دونوں دوروں کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیے بغیر کوئی مرد یا عورت نہ تو تدریجی عمل کی حکمت کو سمجھ سکتا اور نہ اس کو اتنے اعتماد کے ساتھ بیان کر سکتا۔

ایک سفر

اٹلی کی ایک مسیحی تنظیم کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو کی دعوت پر اٹلی کے چند شہروں کا سفر ہوا۔ اور وہاں ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کی۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۵ کی صبح کو ۳ بجے گھر سے نکلا۔ ہماری گاڑی دہلی کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایرپورٹ کی طرف جارہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کہ میں دہلی کو نہیں بلکہ دنیا ہی کو چھوڑ کر چلا جارہا ہوں۔ خیال آیا کہ اگر آج نہیں تو کل ضرور مجھے اس دنیا کو چھوڑ کر اگلی دنیا کی طرف جانا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آئے گا، اس کے بارہ میں خداوند عالم الغیب کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

دہلی ایرپورٹ کی انتظار گاہ میں میرے سامنے ایک دکان ہے۔ اس کے اوپر روشن حروف میں لکھا ہوا ہے: ڈیوٹی سے مکت دکان (duty free shop) میں نے اندر کی الماریوں کی طرف دیکھا تو اس کے اندر زیادہ تر شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی نظر آئیں۔ جہاز میں بیٹھا تو اس کے اندر بھی جہاز کا ایک آدمی مخصوص گاڑی پر شراب اور سگرٹ لئے ہوئے یہ آواز لگا رہا تھا:

Selling liquor, cigarette, selling liquor, cigarette

میں نے سوچا کہ جدید تہذیب نے لوگوں کو شراب میں سکون تلاش کرنے والا بنا دیا۔ اس کے بعد میرا ذہن اسلام کی طرف گیا۔ اسلام ایک ایسا مذہب تھا جو شراب کے بجائے معرفت خداوندی میں انسان کو سکون کا راز بتا رہا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین نے اسلام کی سیاسی تعبیر کرکے اسلام کو صرف جنگجوئی کا مذہب بنا دیا ہے۔ آج اسلام کے علمبردار ساری دنیا میں تشدد کا کلچر چلا رہے ہیں۔ حتی کہ جدید انسان اسلام کو تشدد کا مذہب سمجھ کر اس سے متوحش ہورہا ہے نہ کہ اس کو اطمینان قلب کا راز سمجھ کر اس کی طرف دوڑے۔

ایرپورٹ کے مناظر حسب معمول تھے۔ ایک کے بعد ایک مختلف مقامات پر جانے والی پروازوں کا اعلان ہورہا تھا، اور مسافر اٹھ اٹھ کر گیٹ کی طرف روانہ ہورہے تھے۔ اس کے بعد میری فلائٹ کا اعلان ہوا۔ ضروری مراحل سے گزرتا ہوا جہاز کے اندر داخل ہوا۔ یہ ایئر انڈیا کی

اٹ ۷۹ اتھی جس کے ذریعہ مجھ کو دہلی سے روم جانا تھا۔

جسٹس ایچ آر کھنا بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کانفرنس کی طرف سے مجھ کو دعوت نامہ ملا تو میں نے منتظمین سے ٹیلی فون کے ذریعہ ربط قائم کرنا چاہا مگر ربط قائم نہ ہو سکا۔ پھر میں نے چاہا کہ کوریر سے انھیں خط بھیجوں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یوروپین ایجنسی میں اس کی فیس تقریباً ایک ہزار روپیہ ہے۔ اسی درمیان میں دہلی کے پوسٹ مین سے ذکر ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ اسپیڈ پوسٹ سے بھیجئے۔ چنانچہ انھوں نے اسپیڈ پوسٹ سے بھیجا جس کا چارج صرف چار سو روپیہ تھا۔ اس تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ اسپیڈ پوسٹ کی سروس صرف انڈیا کے لئے نہیں ہے بلکہ باہر کے لئے بھی ہے۔

جسٹس کھنہ بہت کھلے ذہن کے آدمی ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو انھوں نے ایل کے آڈوانی سے کہا کہ تم لوگوں نے ایسا کام کیا ہے کہ اب میرے جیسے ہندستانی کو ہندستان میں رہتے ہوئے شرم آئے گی۔

Justice H.R. Khanna, 5-368, Panchshil Park
New Delhi 110 017 (Tel. 6442726)

راستہ میں ایر انڈیا کی فلائٹ میگزین نمسکار (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون گاندھی جی کے بارہ میں تھا۔ اس کا دو سطری عنوان اس طرح تھا:

Mohandas Karamchand Gandhi,
And, it was no ordinary light

یہ دراصل گاندھی جی پر حال میں شائع شدہ کتاب کا ایک حصہ تھا۔ کتاب کا نام یہ ہے:

A Higher Standard of Leadership:
Lessons from the Life of Gandhi
by Keshavan Nair

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ سچائی کے بارہ میں گاندھی جی کا نظریہ کیا تھا۔ اس کے مطابق، سچائی (truth) ایک ایسی چیز تھی جو ہر آدمی کو الگ الگ دریافت کرنا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو

اپنے ذاتی مذہب پر جینا ہے۔ اس کا کوئی ایسا فارمولا نہیں جو کسی سابق مقدس کتاب میں موجود ہو۔ بلکہ ہر ایک کو اپنا مذہب خود دریافت کرنا ہے:

We have to live life according to one's dharma, not by some formula found in some ancient texts...but by going through the process of discovering one's dharma. (p. 45)

اسی کے ساتھ مضمون میں بتا گیا تھا کہ گاندھی جی یہ کہتے تھے کہ ہر ہر گھر کے اندر بجلی ہونا چاہئے:

Gandhi talked of electricity in every home. (p. 45)

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ گاندھی جی (اور ان کے جیسے دوسرے لوگ) سچائی کو پانے کا جو طریقہ بتاتے ہیں، وہی طریقہ اگر وہ بجلی کے حصول کے لئے بھی بتائیں تو کسی ایک گھر میں بھی بجلی موجود نہ ہو۔ آج یہاں گھر گھر میں بجلی ہے۔ مگر وہ اس طرح نہیں پہنچی ہے کہ ہر ایک شخص نے خود اپنی کوشش سے بجلی کو دریافت کرکے اس کا نظام بنایا، اس کے برعکس، ماضی میں دریافت شدہ علم کو استعمال کرکے ہر آدمی اپنے گھر کو بجلی سے روشن کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

یہی اصول سچائی کے لئے بھی ہے۔ خدا کے پیغمبر پر حقیقت منکشف ہو چکی ہے۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس سے سچائی کی روشنی لے کر اپنی فکر کو منور کریں۔ اگر ہر آدمی خود اپنی کوشش سے سچائی کو معلوم کرنے لگے تو ساری دنیا ہمیشہ کے لئے گمراہی کے اندھیرے میں پڑی رہے گی۔

فلائٹ میگزین میں ایک مضمون تفریح (entertainment) کے اوپر تھا۔ اس کی ایک سطر یہ تھی ——— اے آر رحمان، دھن کے نئے بادشاہ:

A.R. Rahman, The new king of rhythm (p. 69)

اس کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ملیں گے جنھوں نے ادبیات، شاعری، خطابت، مصوری، نشانہ بازی، کھیل اور فنون لطیفہ جیسے شعبوں میں کمال کا مظاہرہ کیا۔

مگر ایسا کوئی مسلمان موجودہ زمانہ میں نہیں ابھرا جو سائنس، ٹکنالوجی اور عصری افکار جیسے شعبوں میں کمال کا ثبوت دے سکے۔ وہ آرٹ کے پہلوان تو ثابت ہوئے مگر حقائق کے میدان میں وہ مینار بن کر کھڑے نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا اصل سبب یہی ہے نہ کہ کسی مفروضہ دشمن کی سازشیں اور مؤامرات۔

نمسکار کے صفحہ ۱۳ پر اسکائی فون (sky phone) کا اشتہار تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اس جہاز کے اندر اسکائی فون (عالمی ٹیلیفون) کا انتظام ہے۔ آپ اس کے اندر سے دنیا کے کسی بھی مقام پر ٹیلیفون کر سکتے ہیں۔ یہاں پوری دنیا آپ کی انگلیوں کے نیچے ہے:

The world at your finger tips...

چارج کی ادائیگی کے سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ٹیلیفون کا بل بین اقوامی طور پر تمام قابل قبول کریڈٹ کارڈ یا کرنسی کے ذریعہ ادا کر سکتے ہیں۔ مثلاً امریکن اکسپرس، ماسٹر کارڈ، ایورو کارڈ، گریٹ وال کارڈ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں قابل قبول کرنسی کے تحت "دینار" کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ مگر کئی بار پڑھنے کے باوجود اس میں ہندستانی روپیہ یا ہندستانی کارڈ کا نام کہیں نہیں ملا۔ یہ ہمارے ملک کی حالت نہ صرف دنیا میں بلکہ خود ہماری نیشنل سروس ایرانڈیا میں بھی ہے۔

ہندستانی لیڈروں کے کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ ملک کو اس اقتصادی پچھڑے پن سے نکالیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی دوسری چیز ملک کو عالمی نقشہ پر باعزت مقام نہیں دے سکتی۔

دہلی سے روم کا فاصلہ ۶۳۹۰ کیلو میٹر ہے۔ یہ ایک براہ راست فلائٹ تھی۔ سوا آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز روم کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس وقت مقامی ٹائم کے لحاظ سے صبح ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ میں اور جسٹس کھنا جہاز سے نکل کر باہر آئے۔

میرا معاملہ نہایت عجیب ہے۔ میں اپنے عجز کی بنا پر ہمیشہ اس اندیشہ میں مبتلا رہتا ہوں کہ میں ایک اجنبی دیس میں جا رہا ہوں۔ وہاں ایرپورٹ پر اتروں گا تو کیا ہوگا۔ وہاں میری مدد کے لئے کوئی شخص موجود نہ ہو تو میں کیا کروں گا۔ اور کہاں جاؤں گا۔ روم کے ہوائی اڈہ میں داخل ہوا تو وہاں بھی شدت کے ساتھ یہی احساس میرے اوپر چھایا ہوا تھا۔ مگر یہاں بالکل مختلف معاملہ پیش آیا۔

روم کے ایرپورٹ پر ساؤتھ انڈیا کے ایک صاحب منیجر کی حیثیت میں ہیں۔ ان کا نام مسٹر ٹی ایس بالاسبرامنیم (Tel. 568-4630) ہے۔ وہ واکی ٹاکی اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہم دونوں کو رسیو کرنے کے لئے جہاز کے باہر موجود تھے۔ اس کے علاوہ خود ایئر انڈیا کے پبلک ریلیشنز آفیسر مسٹر دیش مکھ بھی ہماری رہنمائی کے لئے آگئے تھے۔ ہوائی جہاز سے اتر کر ہم لوگ ایئرپورٹ کے احاطہ میں داخل ہوئے تو یہ دونوں وہاں ہمارے منتظر تھے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کی طرف سے ڈاکٹر فرانسسکو (Dr. Francesco) وغیرہ بھی آئے ہوئے تھے۔

چنانچہ معاملہ میرے اندیشہ کے بالکل برعکس ہوا۔ روم میں ایئرپورٹ پر کسی قسم کی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ انھوں نے ہم کو لے جاکر وی آئی پی لاونج میں بٹھادیا۔ پاسپورٹ لے کر انھوں نے خود یہاں کی ضروری کارروائی مکمل کردی۔ میں یہ غیر متوقع منظر دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ خدایا، آخرت کی دنیا میں جب میرا داخلہ ہو تو وہاں بھی تو میرے ساتھ اسی طرح آسانی کا معاملہ فرما۔ وہاں بھی تو رحمت کے فرشتوں کو میرے استقبال کے لئے کھڑا کردے۔

اس کے بعد بذریعہ کار فلارنس کے لئے روانگی ہوئی جہاں کانفرنس کی کارروائیاں ہونے والی تھیں۔ یہ چار گھنٹہ کا سفر تھا۔ ہمارے ڈرائیور ایک تعلیم یافتہ نوجوان سارجیو (M. Sargio) تھے۔ وہ انگریزی جانتے تھے اس لئے رابطہ میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔

یہ ایک بڑا خوشگوار سفر تھا۔ سڑک نہایت عمدہ تھی جس پر کار ۱۳۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پھسلتی چلی جارہی تھی۔ پورے سفر میں ایک بار بھی ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیتوں اور باغوں کے درمیان جگہ جگہ خوبصورت مکانات تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب جنت کا بعید تعارف ہے۔ یہ چیزیں دنیا میں ناقص صورت میں ہیں۔ آخرت میں وہ کامل اور مکمل صورت میں خدا کے نیک بندوں کو دی جائیں گی (وأتوا به متشابها)

درمیان میں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے ایک سروس اسٹیشن پر رکے۔ سروس اسٹیشن کا جو تصور ہندستان میں ہے یہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت دنیا تھی جس میں گاڑی کی ضرورت کے ساتھ انسان کی ضرورت کی تمام چیزیں نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کردی

گئی تھیں۔ اس کو سروس اسٹیشن کے بجائے رسٹ ہاؤس کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

۱۹۴۷ میں آزادی کے بعد جو پہلی پارلیمنٹ بنی اس کے ایک ممبر کلکتہ کے پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ وہ پارلی منٹ کے اجلاس میں شرکت کے لئے کلکتہ سے دہلی آئے۔ فراغت کے بعد جب وہ بذریعہ ٹرین واپس جانے لگے تو ریلوے لائن کے دونوں طرف انھیں جھگی جھونپڑی کی قطاریں نظر آئیں۔ انھوں نے غربت اور گندگی کے مناظر دیکھے۔ کلکتہ پہنچ کر انھوں نے اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو خط بھیجا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ جب میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے ان بستیوں سے گزرا تو مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ اگر مجھ سے پوچھیں کہ ہندستان کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میں انھیں کیا جواب دوں گا۔ جواہر لال نہرو نے اس کے جواب میں لکھا کہ اصل بات یہ ہے کہ تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

یہ بلاشبہہ ایک غلط جواب تھا، پنڈت نہرو کو چاہئے تھا کہ وہ اس خط کو پڑھ کر تڑپ اٹھتے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو اسے پڑھاتے اور کہتے کہ اب آزادی کے بعد ہمیں سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ ملک کو غریبی اور جہالت کی دلدل سے نکالیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو آج ہندستان بھی یورپ کی مانند ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا۔

جسٹس کھنا نے ایک ملاقات میں صحیح کہا کہ آزادی کے بعد کام کی جو مدت ہندستان کو ملی وہی مدت سنگاپور، کوریا، ملیشیا اور جاپان کو بھی ملی۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ وہ ممالک ترقی کے اعلا درجہ کو پہنچ چکے ہیں اور ہندستان کی حالت یہ ہے کہ وہ دنیا کے چند سب سے زیادہ پسماندہ ملکوں کی فہرست میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔

فلارنس میں قیام کا انتظام ایک تاریخی عمارت میں کیا گیا تھا۔ یہ عمارت کئی سو سال پہلے مانسٹری کے طور پر بنائی گئی تھی۔ اس کا نام کانویٹو (Convitto Ecclessiale) ہے۔ اس کو ازسرنو جدید معیار کے مطابق درست کیا گیا ہے۔ آجکل وہ زیادہ تر مسیحی پیشواؤں کے گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہاں میں کمرہ نمبر ۴۰ میں تھا اور جسٹس کھنہ کمرہ نمبر ۴۱ میں۔

یہ ایک پرشوکت بلڈنگ ہے جو پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ باہر سے وہ قدیم مگر اندر سے

پوری طرح جدید دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کمروں اور دیواروں کو ٹائل سے مزین کیا گیا ہے۔ کمرو اور باتھ روم وغیرہ میں جدید ترین فٹنگ کی گئی ہیں۔ پوری عمارت نہایت صاف ستھری اور مرصع نظر آتی ہے۔ (ملاحظہ ہو تصویر ذیل)

مذہبی حلقوں میں اکثر قدیم عمارتوں کو مقدس سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کو ہر اعتبار سے اس کی قدیم وضع پر باقی رکھا جائے۔ مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ اس کے بنیادی ڈھانچہ میں قدامت کا رنگ باقی رکھتے ہوئے اس کو مکمل طور پر جدید کر دیا جائے۔ عیسائی حضرات کی بہت سی قدیم عمارتوں کو دیکھنے کے بعد میرا اندازہ ہے کہ وہ لوگ اسی دوسرے نظریہ میں یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قدیم عمارتوں کو جدید تکنیک کے استعمال سے از سر نو شاندار تر بنا دیا ہے۔ وہ تاریخ کے اعتبار سے قدیم ہیں مگر استعمال کے اعتبار سے پوری طرح جدید۔

مانسٹری (monastery) تقریباً وہی چیز ہے جس کو ہمارے یہاں خانقاہ کہا جاتا ہے۔

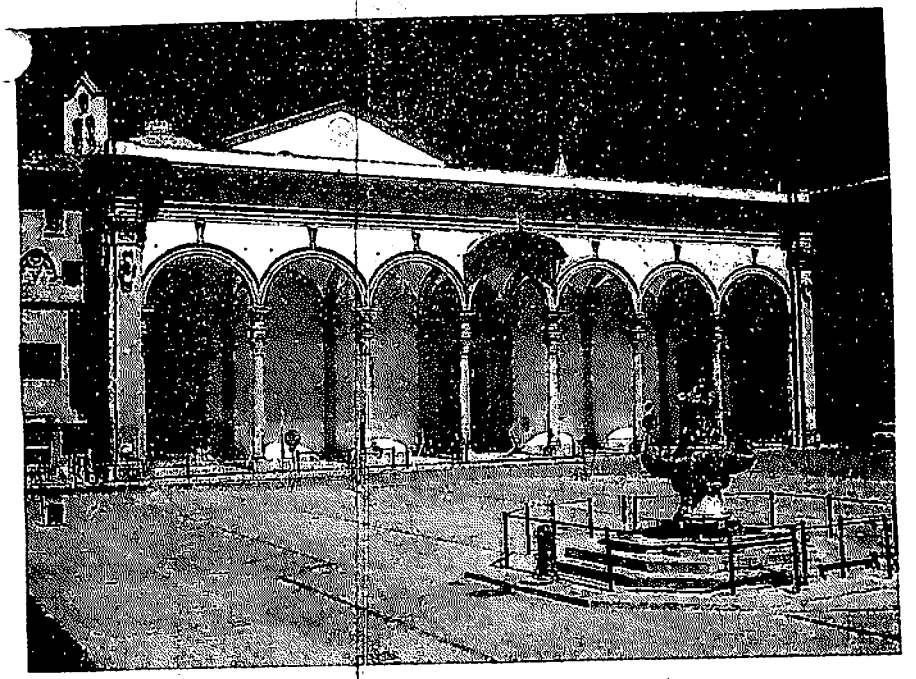

مسیحیت کے بعد کے دور میں مانسٹری یورپ کے ملکوں میں بنائی گئی۔ یہ اکثر ایک وسیع عمارت ہوتی ہے جو ان لوگوں کے قیام کے لئے بنائی جاتی تھی جو اپنے آپ کو مسیحی مذہب کے لئے وقف کر چکے ہوں۔ یہ عام طور پر کسی چرچ کے پاس ہوتی تھی۔ اب غالباً نئی مانسٹری نہیں بنائی جاتی۔ تاہم قدیم زمانہ کی مانسٹریاں کثرت سے یورپ کے مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

مانسٹری کو ایبے (Abbey) بھی کہا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی ایک عمارت انگلینڈ میں ہے جو ویسٹ منسٹر ایبے (Westminister Abbey) کے نام سے مشہور ہے۔ مانسٹری کا طرز عام طور پر یکساں ہوتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں روم کے زوال کے بعد یہی مذہبی ادارے تعلیم اور اشاعت کا مرکز بن گئے (15/223)

فلارنس وسط اٹلی کا ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ کسی زمانہ میں وہ اٹلی کی راجدھانی تھا۔ روم سے وہ ۱۴۵ میل دور ہے۔ فلارنس میں ہر طرف تاریخی آثار پھیلے ہوئے ہیں۔ قدیم عمارتیں، آرٹ کے نمونے، وغیرہ، یہاں بہت بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً لیونارڈو، مائیکل اینجلو، دانتے، میکیاویلی، گلیلیو وغیرہ۔ فلارنس کی موجودہ عظمت اس کے اسی ماضی کی بنا پر ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے کہا:

The present glory of Florence is its Past.

فلارنس کو رومیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں وہ ریاستی راجدھانی بنا۔ اور اس کی اقتصادی اہمیت کافی بڑھ گئی۔ قرون وسطیٰ کے زمانہ میں مسلمانوں کی علمی ترقی کے اثرات فلارنس تک پہنچے تھے۔ مثلاً ماسٹر جیکب (Master Jacob) جو یہیں کا رہنے والا تھا، اس نے ۱۳۰۷ء میں اٹالین زبان میں میتھمیٹکس پر ایک رسالہ تیار کیا۔ اس میں الجبرا کی دو درجی مساوات (quadratic equations) کے ان چھ طریقوں کو بیان کیا گیا تھا جو اس زمانہ کے مسلم حساب دانوں نے وضع کیا تھا۔ (ہٹی، صفحہ ۸۰-۳۷۹)

میرے کمرہ کی دیوار پر ایک بالشت لمبی لکڑی کی صلیب (✝) لگی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر حضرت مسیح کی ایک مزعومہ تصویر مصلوب حالت میں لٹکی ہوئی ہے۔ شاید اسی طرح یہاں کے تمام کمروں میں اس قسم کی صلیب لگی ہوئی ہو۔

میرا مزاج یہ ہے کہ اس طرح کی کسی چیز کو دیکھ کر میرے اندر غصہ یا جھنجھلاہٹ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ میں اس کی حقیقت پر غور کرنے لگتا ہوں۔ چنانچہ اس کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ خیال آیا کہ مسیحیوں کے نزدیک، اپنے عقیدہ کے مطابق، ان کے پیغمبر کی تصویر یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے قربان ہوگیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی اپنی تاریخ کے مطابق ان کے ذہن میں اپنے پیغمبر کی تصویر یہ ہے کہ اس نے دوسروں سے لڑکر ان کے اوپر غلبہ حاصل کیا مذکورہ مسیحی عقیدہ اور مذکورہ مسلم تاریخ نے دونوں قوموں کی مزاج سازی میں نہایت گہرا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے مسیحیوں میں عام طور پر تواضع، خدمت خلق اور دوسروں کے لئے رحمت و رأفت کے جذبات ہوتے ہیں (الحدید ۲۷) دوسری طرف مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں احساس برتری، دوسروں کے لئے عدم اعتراف اور بزور دوسروں کے اوپر غلبہ حاصل کرنے کا مزاج عام ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ جس طرح مسیحی عقیدہ غلط ہے۔ اسی طرح بعد کے مسلمانوں کی مرتب کی ہوئی اسلامی تاریخ بھی اصل واقعہ کے مطابق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح ابن مریم اور محمد بن عبداللہ دونوں ہی خدا کے پیغمبر تھے۔ دونوں نے ایک ہی دین خداوندی کی تعلیم دی دونوں کا پیغام یہ تھا کہ انسان کو خدا کا فرماں بردار بندہ بن کر رہنا چاہئے۔ انسان کو یہاں آخرت کا طالب بن کر زندگی گزارنا چاہئے نہ کہ دنیا کا طالب بن کر۔ دونوں میں جو اصلی فرق ہے وہ باعتبار پیغام نہیں ہے بلکہ باعتبار محفوظیت ہے۔ یعنی حضرت مسیح کا پیغام آج محفوظ حالت میں نہیں پایا جاتا۔ جب کہ حضرت محمد کا پیغام آج بھی پوری طرح محفوظ اور قابل اعتبار حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

عام طور پر میں صبح کو فجر سے کچھ پہلے اٹھ جاتا ہوں۔ مگر آج فلارنس میں پہلی رات تھی، سویرے نیند نہیں کھلی۔ ۲۱ اکتوبر کی صبح کو میں اپنے کمرہ (نمبر ۴۰) میں سو رہا تھا کہ اچانک دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اس کے بعد گھڑی دیکھی تو مقامی وقت کے لحاظ سے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ خدا کا فرشتہ تھا جو ٹھیک آغاز فجر کے وقت آیا۔ اور بتا گیا کہ اٹھو، خدا کو یاد کرو،

کیوں کہ نماز فجر کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ میرے دل نے کہا کہ خدایا، میں ایک عاجز انسان ہوں۔ اسی طرح جب میں غفلت میں پڑوں تو مجھے آگاہ کردے، جب میں بھولنے لگوں تو اپنی رحمت سے تو مجھے یاد دلا دے۔

اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی۔ خیال آیا کہ شاید میں پہلا شخص ہوں جو یہاں نماز ادا کر رہا ہے۔ جو تثلیث کے گھر میں توحید کا اقرار کر رہا ہے۔

اتفاق سے یہاں ایک پاکستانی مسلمان مل گئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے، میں نے خدا کو چھوا ہے۔ اس قسم کی بات بولنا تو کفر ہے۔ پھر آپ کیسے ایسا کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کا کلام ہمیشہ مجازی کلام ہوتا ہے۔ مجازی کلام میں ہمیشہ گویا کہ یا جیسے کہ محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً، اگر میں کہوں کہ آپ شیر ہیں تو یہ جملہ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں ہوگا۔ یعنی گویا کہ آپ شیر ہیں۔ آپ شیر کی طرح بہادر ہیں۔ اگر کوئی شخص اس جملہ کو سن کر کہے کہ وہ تو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ وہ پنجہ نہیں رکھتے، پھر آپ نے ان کو شیر کیسے کہہ دیا تو یہ ایک لغو بات ہوگی نہ کہ کوئی حقیقی اعتراض۔

پھر میں نے کہا کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ خود اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خدا کے بارہ میں اس قسم کی قربت کا احساس تو عین جزء ایمان ہے۔ جو ہر مومن کو ہونا چاہئے۔ دنیا میں اگر آپ پر واسجد واقترب والا تجربہ نہیں گزرا۔ اگر آپ نے کبھی تعبد اللہ کا نک تراہ کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اگر آپ پر یہاں تجدہ تجاھک جیسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اگر آپ پر وہ کیفیت نہیں بیتی جس کو حدیث میں یناجی ربہ کے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے تو آپ نے دین کا صرف چھلکا پایا، دین کا مغز آپ کو نہ مل سکا۔

اس سفر میں کانفرنس کی طرف سے روم کے ڈاکٹر لیونارڈو کو میرا ساتھی اور گائڈ بنایا گیا تھا:

Dr. Leonardo Palmobi (Tel. 5803140, 7259 614)

وہ نہایت سادہ اور نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ وہ قرآن کی اس آیت کا مکمل مصداق ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اور جن لوگوں نے عیسیٰ بن مریم کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت

اور رحمت رکھ دی ہے (الحدید ۲۷)

افریقہ سے آنے والے ایک صاحب نے کہا کہ آپ ایک علمی آدمی ہیں۔ پھر بھی آپ اس طرح کی کانفرنسوں میں آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کانفرنسوں میں ہمیشہ میں بادل ناخواستہ ہی جاتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں ذاتی طور پر ایک علم پسند آدمی ہوں۔ میری سب سے زیادہ محبوب چیز کتابوں کا مطالعہ ہے۔ اس طرح کی کانفرنس کے لئے سفر کرنا میرے لئے گویا مطالعہ کے تسلسل کو توڑنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ تاہم ان کانفرنسوں کا ایک خاص فائدہ ہے جو کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اور میں ذاتی طور پر اسی فائدہ کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس طرح کی کانفرنسوں میں دنیا بھر کے دانشور اور اہل فکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہاں عالی ذہن کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کے لئے ذاتی بے رغبتی کے باوجود میں کانفرنسوں کی دعوت کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔

تاہم اس طرح کی کانفرنسوں سے مذکورہ فائدہ حاصل کرنے کی ایک لازمی شرط ہے۔ اور وہ اجنبی یا مخالف فکر کو کھلے ذہن سے سننے کی صلاحیت ہے۔ آپ کے اندر یہ مادہ ہونا چاہئے کہ آپ اپنے فکری سانچہ سے باہر آکر دوسروں کی بات کو سن سکیں۔ میرے اندر خدا کے فضل سے یہ صفت ہے کہ ایک طرف مجھے اپنے نقطۂ نظر پر کامل یقین ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ میرا ذہن فی الفور اس کے لئے تیار ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی فکر کو الگ رکھتے ہوئے فریق ثانی کی بات کو خود اسی کے اپنے زاویۂ نگاہ سے سن سکے۔ یہ صفت غالباً میرے اندر پیدائشی طور پر ہے، اور اس سے مجھے غیر معمولی فائدے حاصل ہوئے ہیں۔

۲۱ اکتوبر کی صبح کو میں اور جسٹس کھنہ فلارنس دیکھنے کے لئے نکلے۔ رہنمائی کے لئے ہمارے ساتھ ڈاکٹر لیونارڈو موجود تھے، شہر کے اکثر خاص حصے دیکھے۔ بمبئی کی طرح یہاں ملٹی اسٹوری بلڈنگوں کی لائنیں نہیں ہیں۔ تقریباً تمام عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی نظر آئیں۔ ان کی وضع قدیم طرز کی تھی جس میں ایک خاص عظمت جھلک رہی تھی۔ یہ شہر دریائے آرنو (Arno) کے دونوں طرف آباد ہے۔ دریا کے اوپر جگہ جگہ پل بنے ہوئے ہیں۔ ایک پل کے دونوں طرف دو منزلہ دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ پتھر کے اسٹیچو اور چرچ دکھائی دئے۔ ایک جگہ بہت بڑے سائز

مرد و عورت کا اسٹیچو تھا جو بالکل ننگا تھا۔

سیاح بڑی تعداد میں ہر طرف گھوم رہے تھے۔ ایک جگہ ندی کے کنارے ایک بھیڑ تھی۔ وہاں ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت مخصوص لباس میں تھے۔ ان کے اوپر لوگ خوش ہو کر چاول پھینک رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ شادی کی ایک رسم ہے جو صدیوں سے یہاں چلی آرہی ہے۔ ایک سڑک پر بڑی تعداد میں لڑکوں اور لڑکیوں کا جلوس نظر آیا۔ وہ جھنڈا لئے ہوئے اور نعرہ لگاتے ہوئے جارہا تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کا بھاری انتظام تھا۔ یہ ایٹمی ہتھیار کے خلاف تھا۔ وہ نعرہ لگا رہے تھے: اسٹاپ نیوکلیر ٹسٹ۔

فلارنس میں ایک بہت بڑا میوزیم ہے۔ اس کو بھی دیکھا۔ یہ غیر معمولی حد تک شاندار ہے۔ اس میں قدیم فنکاروں کے آرٹ کے نمونے ہیں۔ یہ زیادہ تر پینٹنگ کے نمونے ہیں یا پھر اسٹیچو کے۔ وہ اکثر مذہبی نوعیت کے نمونے تھے۔ بہت سی پینٹنگ میں حضرت مریم کو زمانۂ طفولیت کے مسیح کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت مسیح کے مصلوب کئے جانے کے بارہ میں بہت سے چھوٹے بڑے نمونے تھے۔

جس طرح ہمارے شعرا مضمون بندی کرتے ہیں، اسی طرح مسیحی آرٹسٹوں نے مسیح کی پیدائش اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کے بارہ میں کثرت سے مضمون بندیاں کی ہے۔ شعر و ادب کے علاوہ ان کے بارہ میں طرح طرح کی پینٹنگ یا اسٹیچو تیار کئے گئے ہیں۔

ایک مغربی سیاح کے ہاتھ میں ایک انگریزی میگزین تھا۔ اس نے میرا شوق دیکھ کر اس کو مجھے دیدیا۔ یہ ایک مسیحی تنظیم کی طرف سے نکلتا ہے۔ ۳۲ صفحہ کا یہ ماہانہ پرچہ دنیا کی ۱۲۱ زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔ ان میں بنگالی، ترکی، فارسی اور اردو بھی شامل ہیں۔ اردو ایڈیشن غالباً پاکستان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام اس طرح درج تھا:

The Watchtower
Announcing Jehovah's Kingdom

یہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ کا شمارہ تھا۔ اس کے صفحہ ۲ پر اس کے مقاصد اس طرح لکھے ہوئے تھے:

The purpose of the Watchtower is to exalt Jehovah God as Sovereign Lord of the universe. It keeps watch on world events as these fulfill Bible prophecy. It comforts all peoples with the good news that God's Kingdom will soon destroy those who oppress their fellowmen and that it will turn the earth into a paradise. It encourages faith in God's now-reigning King, Jesus Christ, whose shed blood opens the way for mankind to gain eternal life. *The Watchtower*, published by Jehovah's Witnesses continuously since 1879, is non-political. It adheres to the Bible as its authority.

۲۱ اکتوبر کو شام کا کھانا سینٹ میری مانسٹری میں تھا۔ یہ کافی بڑی عمارت ہے اور نہایت عمدہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے وسیع ہال میں آنے والوں کی کافی تعداد اکٹھا تھی۔ ہر طرف دھیمی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

میں جس میز پر کھانے کے لئے بیٹھا، اس پر مختلف ملکوں کے لوگ تھے۔ اٹلی، جرمنی، ایتھوپیا وغیرہ۔ زیادہ تر تفریحی انداز کی باتیں ہو رہی تھی۔ جرمنی سے آنے والے ایک صاحب نے ایتھوپیا کے نمائندہ سے پوچھا کہ آپ کا ملک کیا چیز میں اکسپورٹ کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چائے۔ پوچھنے والے نے کہا کہ پھر تو آپ دنیا کو اس کی انرجی سپلائی کر رہے ہیں۔

دہلی کے آریہ سماجی لیڈر سوامی اگنی ویش بھی اس کانفرنس میں آئے ہیں۔ وہ شراب کو عنوان بنا کر سماجی اصلاح کی مہم چلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ شراب نوشی کی جڑیں تو ملک میں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ اب اس کو اکھاڑنا سخت مشکل نظر آتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنا تجربہ بتایا کہ ہم لوگ ہریانہ میں گئے۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ اس ریاست میں تو شراب کا رخانہ ہے۔ یہاں ۹۰ فیصد لوگ شراب پیتے ہیں۔ یہاں مشکل سے دس فیصد لوگ اس سے بچے ہوں گے۔ پھر آپ یہاں شراب بندی کی مہم کو کس طرح کامیاب کریں گے۔ اس کے بعد ہم عملی تجربہ کے طور پر کئی گاؤں میں گئے۔ وہاں کے لوگوں کو جمع کیا۔ ہم نے پوچھا کہ کیا تمہاری عورتیں شراب پیتی ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ ہم نے کہا کہ پھر تو آبادی کا ۵۰ فیصد یوں ہی اس سے الگ ہو گیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ کیا تمہارے بچے شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، ہم نے کہا کہ ۲۵ فیصد وہ بھی نکل گئے۔ اس کے بعد ہم نے پوچھا کہ تمہارے بڑے کیا سب کے سب شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب نہیں۔ ان میں سے کچھ پیتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ان میں سے ایک تعداد کو الگ کر لو۔ اس طرح جب دیکھو گے

عوم ہوگا کہ معاملہ الٹا ہے۔ یعنی ۹۰ فیصد لوگ شراب نہیں پیتے۔ صرف ۱۰ فیصد لوگ شراب پیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہی اکثر معاملات میں ہوتا ہے۔ لوگ افواہوں کی بنیاد پر رائے قائم کر لیتے ہیں۔ تحقیق کر کے جاننے کی کوشش نہیں کرتے، حالانکہ اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو اکثر یہ پتہ چلتا ہے کہ اصل حقیقت کچھ تھی اور عوام میں کچھ اور مشہور ہوگئی۔

جسٹس کھنا نے ایک گفتگو کے دوران کہا کہ دور درشن والوں نے مجھ سے پوچھا کہ یونیفارم سول کوڈ کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اس کا مخالف ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ اس پر میری پوری فیملی نے مجھ سے اختلاف کیا۔ لڑکا، لڑکی، بہو، سب نے کہا کہ یونیفارم سول کوڈ تو ہونا ہی چاہئے۔

میں نے جسٹس کھنہ سے پوچھا کہ آپ نظریاتی بنیاد پر یونیفارم سول کوڈ کے مخالف ہیں یا عملی بنیاد پر۔ انھوں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ یونیفارم سول کوڈ بجائے خود تو اچھی چیز ہے مگر اس کے لئے قانون جب بننا چاہئے جب کہ مسلمان بھی اس سے اتفاق کر لیں۔ گویا کہ جسٹس کھنا عملی طور پر وہی رائے رکھتے تھے جو ان کے گھر والوں کی رائے تھی۔

دہلی میں ایک تعلیم یافتہ ہندو نے مجھ سے کہا کہ یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ کی نزاکت یہ ہے کہ ۹۹ فیصد ہندو اس کے حامی ہیں اور دوسری طرف ۹۹ فیصد مسلمان اس کے خلاف ہیں۔ میں نے سوچا کہ ایسی حالت میں یونیفارم سول کوڈ کے خلاف مسلمانوں کا محض شور وغل کرنا اور اس کو شریعت کے خلاف بتانا کافی نہیں۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ اس تصور کو عقلی دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کیا جائے۔ کیوں کہ گورنمنٹ اگر قانون نہ بنائے تب بھی اصل مسئلہ شدید تر صورت میں باقی رہے گا، اور وہ باہمی نفرت ہے۔

جسٹس کھنہ انتہائی بے تعصب اور دیانت دار آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک فیصلہ میں مسز اندرا گاندھی کو ناخوش کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نہ بن سکے۔ ورنہ وہ چیف جسٹس آف انڈیا کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔

انھوں نے اپنے بہت سے قصے بتائے۔ انھوں نے کہا کہ آنجہانی جے آر ڈی ٹاٹا ہمارے ان کے یہاں آئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنی

حالت بتاتے ہوئے کہا: میں مولیہ تو کھا چکا، اب بیاج پر رہا ہوں۔

یہ اس انسان کی بات ہے جو موجودہ زندگی ہی کو آخری زندگی سمجھتا ہو۔ لیکن جو آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ موجودہ زندگی کے بعد ایک اہم تر زندگی آنے والی ہے، اس کا تاثر اس سے مختلف ہوگا۔

جسٹس کھنا نے بتایا کہ انھیں اردو شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ لاہور میں انھوں نے اردو پڑھی تھی۔ اقبال اور غالب کا کلام وہ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اردو شاعروں میں سب سے زیادہ کون آپ کو پسند ہے۔ انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ اقبال کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری حکومت کی نالائقی ہے کہ اس نے اقبال جیسے شاعر کی قدر نہیں کی۔ ۱۹۷۸ میں جب پاکستان میں اقبال کی جنم صدی منائی گئی تو اس سے بھی شاندار طور پر اس کو ہمارے یہاں منایا جانا چاہئے تھا، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اس کے بعد انھوں نے بڑے شوق کے ساتھ اقبال کے کئی شعر سنائے۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں اقبال کے خلاف تعصب اس لئے ہے کہ انھوں نے ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ مگر جسٹس کھنا نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ملک کے بٹوارہ کی ذمہ داری صرف کانگرس لیڈرشپ پر ڈالتا ہوں۔

انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے انھوں نے ایل کے آڈوانی سے کہا تھا کہ دیکھو آڈوانی، اجودھیا میں ایسا کام مت کرنا کہ میرے جیسے ہندو کو اس دیش میں رہتے ہوئے شرم آئے پھر جب بابری مسجد ڈھا دی گئی تو دوبارہ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ جسٹس کھنا نے مسٹر آڈوانی سے کہا کہ تم کو اجودھیا نہیں جانا چاہئے تھا اور نہ یہ کام کرنا چاہئے تھا۔ آڈوانی نے کہا: کھنا جی، اب تو جو ہو گیا ہو گیا۔ اب آگے کی بات کیجئے۔

یہ ایک سیاست داں کی طرف سے اپنی زبان میں غلطی کا اعتراف تھا۔ ۶ دسمبر کے بعد مسلم دانشوروں اور مسلم لیڈروں کو چاہئے تھا کہ حالات کا مطالعہ کر کے وہ اس حقیقت کو جان لیتے۔ اگر وہ بروقت اس حقیقت کو جانتے تو وہ سمجھ لیتے کہ بابری مسجد کا انہدام دراصل اس تخریبی عمل کے اوپر فل اسٹاپ ہے۔ مگر اپنی بے خبری کی وجہ سے انھوں نے اس کو کاما سمجھ لیا۔ تمام

سلم لیڈروں اور تمام مسلم دانشوروں نے انتہائی نادانی کے ساتھ یہ کہہ کر مسلمانوں کو ڈرانا شروع کیا کہ یہ آغاز ہے، اور اب یہ انتہا پسند عناصر اپنی فہرست کے مطابق تین سو یا تین ہزار مسجدوں کو ڈھانے کا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں۔

تاہم حالات کے رخ نے اب خود ہی بتا دیا ہے کہ ۶ دسمبر اس تخریبی عمل کا اختتام تھا، وہ اس کا آغاز نہ تھا۔ اور یہ خود فطرت کا قانون ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو راقم الحروف نے بابری مسجد کے حادثہ کے فوراً بعد ان الفاظ میں لکھا تھا کہ: انتقام اپنی آخری حد پر پہنچ کر ندامت بن جاتا ہے۔ غصہ جب اپنی آخری کارروائی کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ اعتراف میں ڈھل جاتا ہے۔ حیوانیت اپنا آخری روپ دکھانے کے بعد انسانیت کی طرف لوٹ آتی ہے۔ (الرسالہ، جنوری ۱۹۹۳، صفحہ ۴)

۲۱ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد دوبارہ ہم لوگ فلارنس دیکھنے کے لئے نکلے۔ خاص طور پر یہاں کا کیتھڈرل دیکھا۔ وہ ہیبت ناک حد تک بڑا ہے۔ سفید اور کالے ماربل کو ملا کر وہ چودھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوئے تو اس کے وسیع ہال اور اس کی انتہائی اونچی چھت کے نیچے انسانوں کے قافلے بالشتیے کی مانند نظر آتے تھے۔

باہر نکلے تو اچانک ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ پاکستان کے مسٹر اسد صادق (پی آئی اے) تھے جو اپنی اہلیہ کے ساتھ بطور سیاح یہاں آئے تھے۔ وہ کراچی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ یہاں کس سلسلہ میں آئے۔ جسٹس کھنا نے کہا کہ پیس کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ وہ فوراً بولے: کتنا اچھا ہو کہ ہمارے دونوں ملک بھی آپس میں اس طرح کی پیس کانفرنس کریں۔ ان کی اہلیہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں میں دیکھ رہی ہوں کہ یورپ کے ملکوں کے لڑکے اور لڑکیاں آزادانہ طور پر گھوم رہے ہیں۔ کاش اسی طرح ہندستان اور پاکستان کے بچے بھی دونوں ملکوں میں آنے اور جانے لگیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات اتنی سادہ نہیں۔ اس کا تعلق فہم و تدبر سے ہے۔ یورپ کے لوگ اس راز کو جانتے ہیں کہ شکایتیں اور اختلافات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے انھوں نے یہ طے کیا کہ شکایتوں کو الگ رکھتے ہوئے میل جول قائم رکھو۔ اس کے برعکس آپ کے لیڈر یہ کہتے

ہیں کہ پہلے اختلاف اور شکایت کو ختم کرو، اس کے بعد ہم میل جول کی فضا قائم کریں گے۔ حالانکہ اختلاف زندگی کا لازمی حصہ ہے، وہ کبھی ختم ہونے والا ہی نہیں۔

روانگی سے ایک دن پہلے ۱۹ اکتوبر کی شام کو جے پور کے سردار موہندر سنگھ (Tel. 650715) دہلی میں مجھ سے ملے تھے۔ وہ بھی لاہور میں پیدا ہوئے اور وہاں انھوں نے اردو پڑھی۔ وہ راقم الحروف کے مضامین اکثر پڑھتے رہتے ہیں اور بہت زیادہ متاثر ہیں۔

انھوں نے کہا کہ اُس وقت ہندو اور مسلمان ایک ہو کر رہتے تھے۔ میری ماں کا انتقال میرے بچپن میں ہو گیا۔ میرے محلہ میں ایک مسلم خاتون تھیں۔ وہ مجھ کو اپنے بیٹے کی طرح مانتی تھیں۔ ماں کے انتقال کے بعد میں ان کے گھر گیا تو وہ اپنے چھوٹے بچہ کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ مجھ کو دیکھ کر انھوں نے کہا: آؤ بیٹا۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجھے اپنی گود میں لے لیا۔ ان کا بچہ ایک ٹانگ پر بیٹھ گیا اور میں دوسری ٹانگ پر۔ اس کے بعد انھوں نے دو لڈو منگائے۔ ایک انھوں نے مجھ کو دیا اور دوسرا اپنے بیٹے کو۔ یہ قصہ بتاتے ہوئے سردار جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس طرح کے واقعات لوگ اکثر بتاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب ہندو اور مسلمان میں اتنا میل ملاپ تھا تو آخر ملک کا بٹوارہ کیسے ہوا۔ میرے نزدیک اس کی ذمہ داری عوام پر نہیں بلکہ صرف لیڈروں پر ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں صدیوں سے نہایت مل جل کر رہ رہے تھے۔ مگر لیڈروں نے نفرت کی باتیں کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ دیا۔ مثلاً جناح اور نہرو میں انا کا ٹکراؤ (ego clash) ہوا۔ مسٹر جناح اس کا بدلہ جواہر لال نہرو سے لے سکتے تھے۔ مگر مسٹر جناح نے اس کو پوری قوم کا مسئلہ بنا دیا۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تقسیم کے نظریہ کی خاموش حمایت کی۔ اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔

۲۲ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر ایک بشپ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایتھوپیا سے آئے تھے۔ میں نے ایتھوپیا اور اریٹیریا کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ چند لوگوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے یہ تقسیم کی ہے۔ ورنہ وہ دونوں ایک ہی ملک تھے۔ میں نے دونوں کے اقتصادی حالات کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ اریٹیریا تو بہت چھوٹا ہے اور نہایت غریب بھی ہے۔

دہ یا ہر لحاظ سے مقابلۃً زیادہ خوش حال اور ترقی یافتہ ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص اس کو ایک "متعصب مسیحی" کا تبصرہ کہے۔ مگر میں اس کو بالکل درست سمجھتا ہوں۔ آجکل اکثر ملکوں میں علیٰحدہ مسلم خطہ بنانے کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ کئی مقامات پر اس نے تشدد کی صورت اختیار کرلی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ اپنا ایک "اریٹیریا" بنانے کی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ان علاقوں کے لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ پورے ملک کو اپنا میدان عمل بنائیں۔ موجودہ سمٹاؤ کی پالیسی ناقابل فہم حد تک بے معنی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ نسل اندھی تقلید کی حد تک اقبال کی پرستار ہے۔ مگر یہ سب کے سب لوگ عملی طور پر اقبال کے اس شعر کا مصداق بن رہے ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

ناشتہ کی میز پر جسٹس کھنا بھی تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ جیسے سنجیدہ لوگ ہندستان ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ آپ لوگ مل کر تعمیر ہند کا کوئی ابھیان کیوں نہیں چلاتے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کچھ لوگوں نے اس قسم کی کوشش شروع کی تھی۔ مگر میڈیا ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ ہماری تعمیری باتیں بڑے اخباروں کے نزدیک قابل اشاعت نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو اخبار بیچنا ہے۔ ایک اخبار والے نے کہا کہ آپ لوگوں کی بات ہمارے نزدیک خبر (news) نہیں وہ تو صرف ایک فرسودہ چیز (Platitude) ہے۔

ایک صاحب نے ایک فلسطینی ادارہ کا چھپا ہوا ایک پمفلٹ دیا۔ اس کا ایک حصہ بوسنیا کے علی عزت بیگووچ کے بارہ میں تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا:

علی عزت بیگووچ 1925 میں پیدا ہوئے۔ سراجیو یونیورسٹی سے اولاً انھوں نے سوشل سائنس میں اور پھر قانون میں ڈگری حاصل کی۔ نوجوانی ہی کی عمر میں وہ بوسنیا ہرزے گووینا کی ایک اسلامی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس جماعت کی تاسیس بوسنیا کے دو نوجوانوں نے کی تھی جن کے نام محمد خارنچ اور قاسم دوبراجا ہیں۔ یہ دونوں قاہرہ کی جامعہ ازہر کی فیکلٹی آف شریعۃ سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ قاہرہ کے زمانہ قیام میں وہ الاخوان المسلمون سے متاثر

ہوئے۔ چنانچہ واپسی کے بعد انھوں نے اخوانی فکر کو بوسنیا میں پھیلانا شروع کیا۔ یہ جماعت علی عزت بیگووچ اور اشرف تسار مبارک کی قیادت میں یہاں کے مسلمانوں میں انقلابی بیداری لانے کے لئے کام کرنے لگی۔ اس تحریک کا عربی نام حرکۃ الشبان المسلمین تھا۔

علی عزت بیگووچ نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مثلاً اسلام مشرق اور مغرب کے درمیان، عصر حاضر میں اسلامی مشکلات، اسلامی اعلان وغیرہ۔ آخری کتاب کے "باغیانہ" مضامین کی وجہ سے ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۹ تک وہ جنرل ٹیٹو کی حکومت کے تحت جیل میں رہے۔ ایک بار مصر کے صدر جمال عبد الناصر کی ملاقات جنرل ٹیٹو سے ہوئی۔ اس ملاقات میں جنرل ٹیٹو نے صدر ناصر سے کہا تھا کہ علی عزت بیگووچ کی تحریک ان کے لئے الاخوان المسلمون ہی کی طرح خطرناک ہے۔ کیوں کہ اس کا نظریہ حکومت پر قبضہ کرنا ہے۔

علی عزت بیگووچ نے بوسنیا میں "جمہوری عمل پارٹی" بنائی۔ پارٹی کا بظاہر سیکولر نام انھوں نے اس لئے رکھا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسا نام رکھیں جس سے یورپ یا مغربی قوتوں کو یہ محسوس ہو کہ عین مشرقی یورپ کے بیچ میں ایک نئی اسلامی حکومت قائم ہونے جا رہی ہے۔

الیکشن میں علی عزت کی پارٹی کو اتنے زیادہ ووٹ نہیں ملے کہ وہ قطعی اکثریت حاصل کر لیتی۔ تاہم اس نے کثیر جماعتی حکومت میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ علی عزت بیگووچ ملک کے صدر منتخب ہو گئے۔

صدر علی عزت کے دور اقتدار میں بوسنیا میں اسلامی تاریخ کے احیا کی بہت سی کوششیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے اذان اور دیگر علمی اور قرآنی محافل پر مبنی پروگرام نشر کئے جانے لگے۔ علی عزت کے دور حکومت میں پہلی بار صدارتی میٹنگ کو ایک گھنٹے کے لئے موخر کر کے نماز جمعہ ادا کی گئی۔ اس واقعے پر سرب اور کروات نے اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

اس رپورٹ کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ بوسنیا کے مسلم لیڈروں کے لیے جب یہ موقع تھا کہ وہاں کے جمہوری نظام میں الکشن کے ذریعہ وہ صدر کے عہدہ تک پہنچ سکتے تھے تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ بوسنیا کو آزاد مسلم ریاست بنانے کا اعلان کر دیں اور اس کے نتیجہ میں وہاں کے غیر مسلم عوام اور فوج سے وہ لڑائی چھڑے جو بوسنیا کے مسلمانوں کو بالکل تباہ و برباد کر دے۔ ایسے ہی نادانوں کے لیے کہا گیا ہے کہ جو آدھے پر راضی نہیں ہوتا اس کو پورا کھونا پڑتا ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز-۱۱۶

میڈیا اسٹار (دہلی) کے نمایندہ نے ۱۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق پاکستان میں ہونے والے بھیانک شیعہ سنی فساد سے تھا۔

ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پر امن زندگی حاصل کرنے کا راز یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنا علاحدہ ملک بنوائیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ مسلمان دوسروں کے ساتھ صلح و آشتی اور صبر و تحمل کے ساتھ رہنا سیکھیں۔

آل انڈیا ریڈیو کے نمایندہ مسٹر آر پی سری دھر نے ۱۸ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اس مسئلہ سے تھا کہ ملک میں اخلاقی بگاڑ کیوں آیا ہے اور اس کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پہلے سماج کے بڑے لوگ اخلاقی رول ماڈل کا کام کرتے تھے۔ آزادی کے بعد یہ ماحول ختم ہو گیا۔ یہی خلا اخلاقی بگاڑ کا سب سے بڑا سبب ہے۔

ویکلی اکھشر Akhshar کی نمایندہ مسز برکھا اورورا نے ۱۹ ستمبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کم عمر میں لڑکیوں کی شادی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس طرح کے معاملات میں سماجی شعور ضروری ہوتا ہے۔ سماجی شعور پیدا کرنے سے پہلے قانون بنانا ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا۔

ویکلی آوٹ لک (نئی دہلی) کی نمایندہ مسز ساگریکا گھوش (اسپیشل کرسپانڈنٹ) نے ۱۹ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر لبرل مسلمان اور کنزرویٹو مسلمان کے مسئلہ سے تھا۔ اپنی ذات کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ میں ایک کٹر مسلمان ہوں — معروف معنوں میں میں لبرل مسلمان نہیں ہوں۔ اسلام اپنے پیروؤں کو نفرت اور تشدد نہیں سکھاتا۔ اگر کچھ مسلمان نفرت اور تشدد کا طریقہ اختیار کریں تو یہ ان مسلمانوں کا فعل ہوگا نہ کہ اسلام کی تعلیم۔

ہندستان ٹائمس کے نمایندہ مسٹر سدھیر پانڈے نے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

۱۱- ایک اسلامی ادارہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے امریکہ کا سفر کیا۔ یہ سفر تقریباً ایک ماہ (اگست ۔ ستمبر ۱۹۹۶) جاری رہا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲- ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو ڈاکٹر اجے ساہنی سی ایف ٹی وی کی ٹیم کے ساتھ مرکز آئے۔ اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مذہب اور سیاست کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذہبی سیاست نے دنیا کو تباہی کا تحفہ دیا ہے۔ مگر اس کا سبب خود مذہب نہیں ہے۔ اس کا سبب وہ لوگ ہیں جو حقیقۃً مذہبی نہ تھے اور انھوں نے مذہب کو اکسپلائٹ کرنے کے لیے مذہب کا نام لیا۔

۱۳- سوسائٹی آف سرونٹس آف گاڈ (جہانگیر پوری، نئی دہلی) کے تحت ۲۵ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ورلڈ ریلیجنز پریر میٹنگ۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمایندے شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو وہاں اسلام پر ایک ٹاک دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق انھوں نے اس مشترک اجتماع میں اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔

۱۴- گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۲۸ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک درس دیا۔ ایک مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا کہ دین میں بلاشبہ مکمل اطاعت مطلوب ہے۔ مگر یہ مکمل اطاعت افراد یا جماعت کے اپنے حالات کے اعتبار سے ہے نہ کہ شرعی احکام کی تفصیلی فہرست کے اعتبار سے۔ یعنی ہم بقدر فہرست پیروی کے مکلف نہیں ہیں بلکہ اپنے دائرۂ اختیار کے اعتبار سے مکلف ہیں۔

۱۵- پرفکٹ ہیلتھ میلہ (سنجے لیک پارک، نئی دہلی) میں ۴ اکتوبر ۱۹۹۶ کو نماز جمعہ کے بعد ایک جلسہ ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقہ کے لوگ شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے "نماز کیا ہے" کے موضوع پر تقریر کی۔ اور آخر میں سوالات کے جواب دیے۔

گستاخی کرنے والے کے لیے کیا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں سعودی عرب کے عالم کا نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۶۔ سنت کرپال روحانی مشن کے تحت ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا خدا کا باغ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس کو باغ کی نظر سے دیکھے اور اس کے ہر پیڑ اور ہر پودے سے محبت کرے۔

۷۔ ہندستان ٹائمس کے نمایندہ مسٹر سدھیر شرما نے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو جامعہ کے پرو وائس چانسلر کو سلمان رشدی کا حامی بتا کر ان کے خلاف چلنے والے ایجی ٹیشن کے بارہ میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس قسم کا تخریبی مزاج دینی مدرسوں میں بنایا جاتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ یہ مزاج اگر مدرسوں میں بنایا جاتا تو اس قسم کے ہنگامے سب سے پہلے مدرسہ میں نظر آتے۔ حالاں کہ کسی بھی مدرسہ میں ایسا نہیں ہوا۔

۸۔ جرمنی (فرینکفرٹ) کے سفید فام اسکالرس کی ایک ٹیم ۲۳ ستمبر ۱۹۹۶ کو اسلامی مرکز میں آئی یہ نو افراد تھے۔ اس ٹیم کی لیڈر ایک سینیر خاتون (Thea Mohn) تھیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کو برحق آپ کیوں مانتے ہیں۔ کیا کسی استاد نے آپ کو ایسا یقین دلایا ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسلام میری ڈسکوری ہے۔

۹۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: قرآن کا رول انسانیت کی تاریخ میں۔

۱۰۔ امریکہ کی یونی ورسٹی آف ساوتھ کیرولینا کے پروفیسر ڈاکٹر رابرٹ ورسنگ (Dr Robert Wirsing) نے ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو پروفیسر کی ایک زیر ترتیب کتاب کے سلسلہ میں تھا۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا:

Babri Masjid was demolished not by Mr Hindu; it was demolished by Mr Ego. And it was Muslim leadership which turned Mr Hindu into Mr Ego.

اُردو	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہور اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعہ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوار حکمت	-
اقوال حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	25/-
عقلیات اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	8/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلہ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
فکر اسلامی	50/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعدد ازدواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	3/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسول	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتپنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک دھرم	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پنر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسول	25/-
میدان عمل	25/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

	Rs.
God Arises	95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	7/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Presenting the Qur'an	165/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
Treasury of the Qur'an	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

RNI 28822/76 ... (SE) 12/96
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333